فوزیہ شاہین*

خالد آفتاب کے افسانوں کا تانیثی و صنفی تجزیہ

Feminist and Gender Analysis of Khalid Aftab's Short-Stories

Abstract:

In the early twenty-first century, women worldwide faced various novel challenges in their personal, familial, professional, and social lives, particularly in their interactions with men. Pakistani women had to confront more challenging circumstances. In this article, Khalid Aftab's short stories are examined in the context of gender studies and feminism to identify the problems and challenges faced by women in Pakistan's unique socio-cultural environment. The thematic analysis of selected short stories from three fictional works, *Jahān ander Jahān* (2014), *Bhedī* (2018), and *Potlī* (2024), has been conducted. Most of the stories involve gender issues, including the dynamics of power relations between men and women, constructions of gender and sexuality, and concepts of masculinity and femininity. Additionally, critical topics such as homosexuality, male dominance, violence against women, sexual exploitation, forced marriages, and marital rape have been discussed. The narratives illustrate that women are becoming increasingly cognizant of their human rights due to advancements in education and increased economic participation. This growing awareness fosters women's self-confidence, enhances decision-making capabilities, and contributes to their empowerment, which is leading to significant societal transformations in Pakistan. Khalid Aftab's fiction is a substantial breakthrough in advancing the contemporary discourse on gender equality and women's rights in the region.

Keywords: feminist, gender, sexuality, forced marriage, violence, empowerment.

خالد آفتاب (پ: ۱۹۴۴ء)[1] نے اگرچہ ادب کے میدان میں دیر سے قدم رکھے ہیں، مگر انھوں نے دس برسوں میں تین افسانوی مجموعے اردو کو دیے ہیں: جہاں اندر جہاں (۲۰۱۴ء)، بھیدی (۲۰۱۸ء) اور پوٹلی (۲۰۲۴ء)۔ انھوں نے کل پینسٹھ افسانے تخلیق کیے ہیں، جو اپنے موضوعات کے لحاظ سے متنوّع ہیں۔ یہ افسانے انسانی زندگی، بالخصوص مرد و عورت کے باہمی مراسم کو ایک بھید کی طرح پرت در پرت کھولتے ہیں، اور بھید پھر بھی قائم رہتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک مرد کے لکھے ہوئے افسانے ہیں، مگر ان میں صنفی حساسیت، عورت کی معاشی خود انحصاری، خود اعتمادی اور تانیثی شعور کا مؤثر اظہار ہوا ہے۔ علاوہ ازیں یہ افسانے عورت کے تشخص، اس کی انفرادیت اور ذاتی و خانگی زندگی پہ سماج کے اثرات، معاشرے میں عورت کا کردار، اور صنفی تفریق کی

وجہ سے روا رکھے جانے والے جنسی استحصال، جبر و تشدد، اور عورت کے جذبات واحساسات کی تکذیب جیسے حساس موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اِن مسائل پر جدید سماجی سائنسوں میں تو دنیا بھر میں خوب تحقیق ہو رہی ہے، مگر پاکستان میں ہم ان دیرینہ اور کچھ نئے مسائل کو آج بھی تہذیب و تمدن اور کلچر کی چادر میں لپیٹ کر رکھنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔

خالد آفتاب کے افسانوں کا تانیثی و صنفی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو دلچسپ حقائق سامنے آتے ہیں۔ مصنف یوں تو ماہر تعلیم ہیں مگر ان کی تخلیقی کاوشوں سے ان آفاقی و علاقائی صنفی، سماجی و نفسیاتی مسائل کی نشان دہی ہوتی ہے، جو آج ''صنفی مساوات اور خواتین کی خود مختاری''(gender equality and women's empowerment) کے ماہرین اور انسانی حقوق کے علم برداروں کو در پیش ہیں۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے سوتے صدیوں کے انسانی تجربات اور اجتماعی رویوں سے پھُوٹتے ہیں اور جو بالخصوص پچھلی کئی دہائیوں سے ہمارے سماج پہ غالب ہیں۔ قیام پاکستان سے لے کر اکیسویں صدی کے پاکستان تک کا سفر پاکستانی معاشرے، بالخصوص عورتوں نے جس نہج پہ طے کیا ہے، اس کی جھلک ہمیں خالد آفتاب کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کے تینوں مجموعے ہمارے تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ معاشی تفریق اور سیاسی منظر نامے اور ان سے جنم لینے والی معاشرتی ناانصافی، صنفی تفریق، حقوق نسواں کی پامالی اور نفسیاتی الجھنوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جہاں معاشرے کے دیگر افراد ان حالات و واقعات سے متاثر ہوتے ہیں، وہاں ان جملہ مسائل اور ان سے جنم لینے والی صنفی تفریق اور معاشرتی تعصبات کے سبب پاکستانی خواتین دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کرتی دکھائی دیتی ہیں، نتیجتاً انسانی ترقی اور وقار کی مقامی و عالمی اقدار سے محروم نظر آتی ہیں۔ ان افسانوں میں عورت کے احساسات و خواہشات اور مرد و عورت کے جنسی مراسم سے وابستہ ایسے کئی اہم موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے جن پر بسا اوقات خواتین مصنفین بھی توجہ نہ دے سکیں۔ یہ کہنا بجا ہو گا کہ مصنف نے خواتین کی زندگی، بالخصوص ان کے ساتھ صنفی امتیاز کے سبب ہونے والی معاشرتی ناانصافیوں اور ان سے جنم لینے والی پیچیدہ نفسیاتی الجھنوں نیز مرد اور عورت کے غیر متوازن باہمی تعلقات کو مؤثر افسانوی پیرائے میں بیان کیا ہے۔

اس مطالعے کا مقصد نہ صرف پاکستانی معاشرے میں عورت کو در پیش مسائل اور دشواریوں کا احاطہ کرنا ہے، جنھیں مصنف نے اپنے مختلف افسانوں میں پیش کیا ہے، بلکہ ان محرکات کو بھی زیر بحث لانا ہے، جو پس پردہ کار فرما ہیں۔ تاہم خالد آفتاب کے افسانوں کے موضوعات کا احاطہ کرنے سے قبل تانیثی تحریکوں کا مختصر جائزہ لینا مناسب ہو گا، جن کے اثرات ہمارے معاشرے پر پچھلی صدی کے آخری نصف حصے اور بالخصوص اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں خواتین کی آزادی اور حقوق کے ضمن میں مرتب ہوئے ہیں۔

تانیثی تحریکیں اور چیدہ صنفی تصوّرات

یوں تو حقوق نسواں کی تحریکوں سے جنم لینے والے افکار و نظریات کا سفر کئی صدیوں پہ محیط ہے، جن کا واضح اظہار سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے اوائل میں، مغربی خواتین کی ادبی تحریروں سے ہوتا ہے۔ اِن تحریروں میں خاندانوں میں رائج پدر سری نمونوں(patriarchal patterns)اور مروجہ سماجی و ثقافتی درجہ بندیوں میں خواتین کی کم زور حیثیت کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی۔ تاہم مشہور برطانوی مصنفہ اور فلسفی، میری وولسٹون کرافٹ(Mary Wollstonecraft۔۱۷۵۹ء-۱۷۹۷ء) نے اپنی کتاب عورت کے حقوق کی توثیق: مع سیاسی اور اخلاقی موضوعات پر پابندیاں (*A Vindication of the Rights of Woman: With Strictures on Political and Moral Subjects*)میں مدلل انداز میں خواتین کے حقوق کی وکالت کی اور خواتین کے لیے "عقل"، "تعلیم"، اور "اظہار و بیان"(voice) کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے واضح کیا کہ حقوق کی جدوجہد کا مطمحِ نظر عورت کا خود پہ اختیار حاصل کرنا ہے نہ کہ ان کا مردوں پر اقتدار رکھنا اہم ہے[۲]۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں امریکا اور یورپ میں ابھرنے والی خواتین کی تحریکوں کے نتیجے میں انھیں ووٹ کا قانونی حق ملا۔ آزادیِ نسواں کی پہلی لہر (انیسویں صدی تا بیسویں صدی کا آغاز) کے دوران شہریت اور جائیداد کے حقوق سے شروع ہونے والی جدوجہد نے خواتین کی قانونی حیثیت کے بارے میں بیداری پیدا کی، اور خواتین کی محکومی اور محکوم حیثیت کی گہری جڑوں پر سوال اٹھائے گئے۔ اس ضمن میں نامور وجودی فلسفی اور حقوق نسواں کی داعی سمون دی بووا(Simone de Beauvoir۔۱۹۰۸ء-۱۹۸۶ء) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب بعنوان دوسری جنس (*The Second Sex*)(۱۹۴۹ء) میں خواتین کی شناخت اور حیثیت پر سوال اٹھاتے ہوئے استفسار کیا کہ تاریخی طور پہ مرد کیوں کر عورت کو اپنے تقابل میں "غیر"(the other) اور "کم تر"(subordinate to men) سمجھتے آئے ہیں[۳]۔ دی بووا نے مردوں کے لیے "موضوع"(the Subject)اور "مطلق" (the Absolute)اور عورتوں کے لیے "غیر"(the other)اور "شے"(Object) کی اصطلاحات استعمال کیں[۴]۔ عورت کا مرد پہ انحصار اور اس کی غیر مساوی حیثیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دی بووا کے نزدیک: "مرد اور عورت کبھی دنیا میں یکساں طور پر حصہ دار نہیں رہے"[۵]۔ دی بووا نے جنس کی حیاتیاتی تقسیم و تفریق پر بھی سوال اٹھایا اور صنف(gender) کو بار بار انجام دیے جانے والے روّیوں، کرداروں اور اعمال(performativity) کا نتیجہ قرار دیا۔ یہ تانیثیت کی دوسری لہر کا نقطۂ آغاز تھا۔ دی بووا کے ان نظریات نے حقوقِ نسواں کی جدّوجہد کو آگے بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ بعد ازاں سماجی و صنفی ماہرین نے جینڈر کی سماجی تشکیل اور سیاسی حیثیت پہ تحقیق و تنقید کی اس روش کو آگے بڑھایا۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۸۰ء کی دہائیوں میں حقوقِ نسواں کی دوسری لہر کا ہدف تعلیم اور ملازمت کے ذریعے، خاندان اور معاشرے میں صنفی مساوات، خواتین کے سماجی اور معاشی حقوق کا تحفظ اور ان کی جانب روا رکھے

جانے والے صنفی ناانصافی اور جبر پر مبنی روّیوں اور طرز ہائے عمل کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں لبرل، اشتراکی، بنیاد پرست، ہم جنس پرست، اور حقوقِ نسواں کے دیگر گروہوں نے جنم لیا۔ اس عرصے کے دوران، حقوقِ نسواں اور خواتین کی علمی کاوشوں نے آنے والے سالوں میں خواتین کو بااختیار بنانے کی راہ ہموار کی۔ اس دور میں ایک امریکی مصنفہ اور تانیثی مفکر بیٹی فریڈن (Betty Friedan۔۱۹۲۱ء-۲۰۰۶ء) نے اپنی کتاب بعنوان نسائی اسرار (*The Feminine Mystique*) میں روایتی کرداروں کی ادائیگی کے نتیجے میں خواتین میں جنم لینے والی "بوریت" (boredom) اور "خالی پن" (emptiness) پر سوال اٹھاتے ہوئے ذاتی تکمیل کی تلاش پہ زور دیا ہے[۶]۔ اس نے دریافت کیا کہ شادی شدہ، متوسط طبقہ کی گھریلو خواتین، اور دوسروں کی دیکھ بھال کرنے والی خواتین خود کو "غیر موجود" محسوس کرتی ہیں، اور ان کا "خالی پن" گھر میں روایتی ذمہ داریوں اور دوسروں کی مسلسل دیکھ بھال کے ان کی زندگی پر اثرات کا نتیجہ ہیں، یہ روایتی گھریلو کردار ان میں تکمیلِ ذات کا احساس دلانے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس غیر حل شدہ مسئلے کا نام فریڈن نے "بغیر نام کے مسئلہ" (the problem that has no name) رکھا[۷]۔ یوں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائیوں میں شروع ہونے والی تحریکِ نسواں کی دوسری لہر نے صنفی مساوات اور صنفی امتیاز کے مسائل پر توجہ مرکوز کی۔ ابتدائی طور پر ریاست ہائے متحدہ میں امریکی خواتین سے شروع ہونے والی، حقوقِ نسواں کی تحریک جلد ہی دوسرے مغربی ممالک میں پھیل گئی، جس کا نتیجہ ۱۹۷۵ء تا ۱۹۸۵ء کا عرصہ "خواتین کے لیے اقوام متحدہ کی دہائی" (The United Nations Decade for Women) کے طور پر قائم کرنے کی صورت میں نکلا، تاکہ خواتین کے حوالے سے کی جانے والی بین الاقوامی جدوجہد کی ترقی اور ناکامیوں کا جائزہ لیا جاسکے۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۷۹ء میں خواتین کے خلاف امتیازی سلوک کی تمام اقسام کے خاتمے کا عالمی قانون منظور ہوا، جس کی توثیق پاکستان نے ۱۹۹۶ء میں کی۔ حقوقِ نسواں کی تیسری لہر ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر اور ۱۹۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں عورتوں کے زمرے میں ہونے والے مباحثوں کا جواب دیتی ہے، جس کا آغاز دوسری لہر کے زیر اثر عورت کی وجودی شناخت اور ان سے جنم لینے والے نظریات کے تنازع پر تنقید سے ہوا، تاہم ان مباحث کا محور مغرب کی متموّل اور "سفید عورت" کے تجربات تھا۔ جنس کی مرد و عورت میں تخصیص (binary sex) کو چیلنج کر دیا گیا۔ تانیثیت کی تیسری لہر تین اہم نکات پہ مبنی تھی: صنفی شناخت کے باہمی ارتباط (intersectionality) یعنی جنس کے تصوّر اور نسلی تفریق، ذات برادری، معاشی مقام، اور جغرافیائی حقیقتوں کا باہمی ربط ہے؛ جسمانی خود مختاری (bodily autonomy) اور صنف کی ردِّ تشکیل (deconstruction of gender)۔ شناخت کے عمل میں یہ تمام عوامل آپس میں تعامل کرتے ہیں۔ ان مباحث کے نتیجے میں عورت کے تولیدی و جنسی حقوق اور جنسی آزادی کی آواز بلند ہونے لگی۔ مغربی تحریکوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نظریات کی ترویج دنیا بھر میں، بشمول ایشیا تیزی سے ہونے لگی، تاہم تیسری دنیا کی عورتوں نے اپنے منفرد مسائل پہ آواز بلند کی اور اپنے مقامی

ماحول کے پس منظر میں اپنے حقوق کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ مغرب و مشرق سے اٹھنے والی یہ آواز پاکستان میں بھی بتدریج پچھلی کئی دہائیوں سے گونج رہی ہے۔ اگرچہ قیامِ پاکستان کے دوران اور تعمیرِ پاکستان میں خواتین نے اپنا نمایاں کردار ادا کیا؛ بچیوں اور خواتین کی تعلیم، صحت اور معاشی ترقی میں مختلف تنظیموں بشمول اپوا(All Pakistan Women's Association) سے وابستہ پاکستانی خواتین نے نمایاں فرائض سرانجام دیے۔ تاہم جنرل ضیاالحق کے مارشل لا(۱۹۷۷ء تا۱۹۸۸ء) کے دوران پاکستانی خواتین نے منظّم انداز میں اپنے قانونی و بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی۔ اس ضمن میں 'ویمن ایکشن فورم' نے کلیدی کردار ادا کیا۔ تانیثیت کی چوتھی لہر کا آغاز ۲۰۱۲ء کے آس پاس ہوا اور اس کی خصوصیت خواتین کو بااختیار بنانے، انٹرنیٹ وسائل (internet tools) کے استعمال، صنف کی بنیاد پہ روا رکھے جانے والا تشدد، بالخصوص گھریلو تشدد، ہراسانی اور جنسی تفریق پہ مبنی مسائل، ہم جنس پرستی، ٹرانس جینڈر، غیر روایتی جنسی شناخت کا نظریہ(Queer theory) جیسے موضوعات سے عبارت ہے۔ عصرِ حاضر میں پاکستانی خواتین کے قانونی حقوق کے تحفظ نیز تشدد اور جبر کی ممکنہ صورتوں سے نبردآزما ہونے کے لیے تعلیم، صحت، معاشی خودمختاری، خواتین کے خلاف روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک، رسومات، روایات اور گھریلو تشدد اور جنسی استحصال کے خلاف قوانین وضع کرنے کی جدوجہد جاری ہے۔ بیل ہکس(Bell Hooks۔۱۹۵۲ء-۲۰۲۱ء) نے اپنی کتاب بعنوان فیمینزم سب کے لیے ہے: پرجوش سیاست(*Feminism Is for Everybody: Passionate Politics*) میں تانیثیت کو جنس پرستی، جنسی استحصال اور جبر کو ختم کرنے کی تحریک قرار دیا[۸]۔ درحقیقت تانیثیت کی تمام تحاریک کا حتمی مقصد صنفی مساوات اور خواتین اور بچیوں کی استعداد اختیار (empowerment) کو فروغ دینا ہے، جو اقوام متحدہ کے مقرر کردہ ہزار سالہ ترقیاتی اہداف(Millenium Development Goals۔۲۰۰۰ء-۲۰۱۵ء) اور پائیدار ترقی کے اہداف (Sustaiable Development Goals۔۲۰۱۵ء-۲۰۳۰ء) کی ایک اہم کڑی ہے۔

اس مقالے میں خالد آفتاب کے افسانوں کا تجزیہ حقوقِ نسواں کی تحریکوں سے جنم لینے والے نظریات و خیالات اور اکیسویں صدی کے عصری صنفی مسائل کی روشنی میں پاکستان کے مخصوص سماجی اور ثقافتی تناظر میں کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی کی پہلی سہ ماہی میں دنیا بھر میں مرد اور عورت کے روایتی صنفی کردار تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ صنفی کرداروں میں یہ تغیر و تبدل جہاں ثقافتی، سماجی، سیاسی و معاشی تبدیلیوں کا پیش خیمہ رہا ہے۔ وہاں تانیثی تحریکوں کے زیرِ اثر جنس(sex) اور صنف(gender) کے تصوّرات و نظریات کی تعبیر و توضیح نے اس تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بووا نے ۱۹۴۹ء میں صنف کی سماجی تشکیل کا نظریہ پیش کیا اور اس بات پہ زور دیا کہ "عورت کا تعین اس کے ہارمونز یا پراسرار جبلتوں سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جسم اور دنیا سے اس کا تعلق اس کے (عورت کے) علاوہ دوسروں کے عمل سے تبدیل ہوتا ہے"[۹]۔ صنفی فلسفی جوڈتھ بٹلر(Judith Butler۔پ:۱۹۵۶ء)

کے نزدیک صنف جامد نہیں بلکہ یہ کارکردگی پہ مبنی (performative)، سیال (fluid) اور ثقافتی طور پہ تعمیر کی جاتی (culturally constructed) ہے، یہ اپنی ساخت میں حیاتیاتی نہیں بلکہ سماجی و ثقافتی طور پر بار بار انجام دیے جانے والے اعمال کے نتیجے میں تشکیل پاتی ہے، اس لیے مردانہ (masculine) اور نسائی (feminine) کردار سماجی طور طریقوں اور رسومات کے تواتر سے انجام دینے سے ترتیب پاتے ہیں"[۱]۔ اس نقطۂ نظر سے اگر خالد آفتاب کے افسانوں کی روشنی میں پاکستانی معاشرے میں عورت اور مرد کے صنفی کردار، رویّہ جات، اور فکری انداز میں ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھا جائے تو خواتین کے صنفی کردار میں تبدیلی نمایاں دکھائی دیتی ہے جب کہ افسانوں کے مرد کردار بالعموم روایتی اور عمومی ہیں۔ عورتوں کی کردار نگاری میں ان سے وابستہ دقیانوسی تصوّرات (stereotypes) اور سماجی اقدار کی بیخ کنی کرتے ہوئے ان کو صنفی شناخت کے مراحل طے کرتے دکھایا گیا ہے۔ ایسا ایک مرد مصنف کے تانیثی فلسفے میں یقین رکھنے اور صنفی حساسیت کا حامل ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔

خواتین کی کردار نگاری

بحیثیت مجموعی، خالد کے افسانوں کی عورت جیتی جاگتی، باشعور اور صنفی آگاہی رکھنے والی ہستی ہے، جو معاشرے میں مختلف حیثیتوں سے تفویض کردہ کردار ادا کر رہی ہے اور تبدیل ہوتے ہوئے سماجی سانچوں میں ڈھلنے کی سعی بھی کر رہی ہے۔ ان کے افسانوں کی عورت ایک محبوبہ بھی ہے، ماں بھی ہے، بیٹی بھی، بیوی بھی، گھریلو عورت بھی ہے اور معاشی تگ و دو میں پسنے والی عورت بھی ہے، مگر وہ جس حیثیت کی حامل ہے، وہ سوچتی ہے، تجزیہ کرتی ہے، اور اپنی رائے کا اظہار کرتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانوں کی عورت مظلوم، منفعل، اور کم حیثیت نہیں، بلکہ سوال کرتی اور اپنے ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ وہ توجہ کی متلاشی نہیں بلکہ زندگی میں اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پہ نگاہ رکھتی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ مصنف نے عورتوں کی زندگی میں شادی اور محبت کی اہمیت کے حوالے سے خوب لکھا ہے، مگر یہ تحریریں سطحی نہیں، بلکہ انھوں نے شادی اور محبت سے جڑے مسائل اور باریکیوں کو منجھے ہوئے انداز میں پرت در پرت کھولا ہے۔

مصنف کی بیش تر مختصر کہانیوں میں خواتین کے کردار مرکزی اور بنیادی ہیں اور کہانیاں مختلف نسوانی کرداروں کے گرد بنی گئی ہیں، نیز جہاں عورت کا کردار ثانوی ہے اور کہانیوں کا مرکز مرد کردار ہیں، وہاں بھی عورت کی شخصیت مضبوط اور توانا دکھائی گئی ہے۔ عورت کا کردار خواہ مرکزی ہو یا ثانوی، قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے، گویا مصنف نے اس عورت کے دل میں بیٹھ کر یہ تحریریں رقم کی ہیں۔ افسانے کا یہ رنگ اور صنفی حساسیت کی تصویر کشی ہمیں کرشن چندر (۱۹۱۴ء-۱۹۷۷ء) کے افسانوں، بالخصوص "پریتو"، "پورے چاند کی رات"، راجندر سنگھ بیدی (۱۹۱۵ء-۱۹۸۴ء) کے افسانوں: "کوکھ جلی"، "لاجونتی" اور "چھوکری کی لوٹ"، نیز گلزار (پ: ۱۹۳۴ء) کے افسانوں: "ہاتھ پیلے کر دو" اور "سپوت" میں دکھائی دیتی ہے۔

افسانوں کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہے۔ اظہار و بیان کے لیے منفرد الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ افسانوں کے عنوان انوکھے اور دل چسپ ہیں۔ مثال کے طور پہ "موناجی"، "ٹیوننگ"، "اے ٹی ایم"، "وائرس"، "میرا بے بی"، "رجی پجی"، "تگڈم"، "پپونا"، "پوٹلی" وغیرہ۔ بیش تر صورتوں میں عورت، مرد اور غیر تنوی کردار اپنے اظہار و بیان کے انداز سے معاشرتی رویّوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ افسانوں میں مرد و عورت کے ظاہری خدوخال اور شخصی اوصاف کی تشریح کے لیے مختلف امثال، تشبیہات اور استعارے استعمال کیے گئے ہیں، جو ہمارے سماجی و ثقافتی رویّوں کو عیاں کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مردوں کے لیے "چغد مرد"، "الو، باٹا قسم کا خاوند"، "لچا لفنگا"، "حرام کے نطفے"، "سینڈو"، "لگڑ بگڑ"، "پینسل مچھ"، "باسی سموسے جیسا مرد"، "چپکو آدمی"، "لسوڑا"، "سنگھاڑا نما آدمی"، "ازلی رنڈوا"، جب کہ عورت کے لیے "فالتو بکری"، "ننگی تلوار"، "مری مکی"، "بازاری عورت"، "پانچ ہاتھ کی زبان والی چودھرانی"، اور "مست بکری" جیسی تشبیہات و القاب اور مقامی زبان و بیان استعمال کیے ہیں۔ عورتوں کو جانوروں سے تشبیہ اور ان کے اظہار و بیان اور کردار پہ تنقید کے لیے مختلف القاب دینے کے روایتی نمونے پیش کیے ہیں۔

افسانوں کے موضوعات-اجمالی جائزہ

اس مقالے میں خالد آفتاب کی کہانیوں کے موضوعات (themes) کو تانیثی و صنفی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ موضوعات ہیں جو عالمی تانیثی تحریکوں کے نتیجے میں ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بالخصوص پروان چڑھے اور اکیسویں صدی کے پہلے ربع کے اختتام پر نمایاں سماجی تبدیلیوں کی صورت میں پاکستانی معاشرے میں بھی وقوع پذیر ہوتے دکھائی دے رہے ہیں، جن کا نمایاں اظہار خالد آفتاب کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ ان موضوعات کا اجمالی جائزہ درج ذیل ہے۔

بحیثیت مجموعی "جہاں اندر جہاں" کے افسانوں میں شادی و ازدواجی زندگی سے منسلک معاملات کا احاطہ کیا گیا ہے[11]۔ کثرتِ ازواج (افسانہ بے بس)، کم عمری کی شادی (افسانہ اندھا دھند) زبردستی کی بے جوڑ شادی اور صنفی جنسی توقعات (افسانہ تپش)، اور غیر ازدواجی معاملات (افسانہ الجھن) جیسے موضوعات پہ سماجی پس منظر میں کہانیاں رقم کی گئی ہیں۔ مصنف نے بچپن میں نو عمر لڑکیوں کے ساتھ ہونے والی جنسی درندگی (افسانہ تماشا)، عورتوں کے جنسی استحصال (افسانہ ٹیوننگ)، اور غریب عورت کی عصمت دری (افسانہ نقص امن) پر آواز بلند کی ہے۔ علاوہ ازیں، بیوہ عورت کی شادی (افسانہ اجازت)، ساس کا روایتی کردار (افسانہ سایہ) اور صنفی امتیاز، بشمول بیٹے کو بیٹی پہ ترجیح دینا (افسانہ معاملہ) اور سماجی و ثقافتی رسومات اور روایات، پردہ کی رسم اور جنسی مراسم کی خواہش کا امتزاج (افسانہ نقاب) اہم موضوعات ہیں۔

دوسرے مجموعے بھیدی میں مندرجہ بالا موضوعات کے علاوہ سیاسی و سماجی پس منظر میں آفاقی و علاقائی سطح پہ وقوع

پذیر ہونے حالات و واقعات سے جنم لینے والی کہانیوں کا احاطہ کیا گیا ہے"[۱۲]۔ مثال کے طور پر ان کا افسانہ "سر راہ" دو ہم جماعتوں: کمال الدین اور ثریا کی کہانی ہے۔ ان کی اچانک ملاقات لاہور کے انار کلی بازار میں ہوتی ہے اور وہ پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ افسانہ اس عہد کے اہم ترین مسئلے دہشت گردی کی جھلک دکھاتا ہے۔ "گمنام" پنجاب کی ایک طوائف اور معروف گائکہ جمال بیگم کی کتھا ہے، جو قیام پاکستان کے نتیجے میں ہجرت کر کے انبالہ سے اندرونِ لاہور آن پہنچتی ہے، اور اپنے ہم راہ شملہ کے بیوپاری شکیل درانی سے مراسم کی نشانی کو یہاں پہنچ کر جنم دیتی ہے، اور بچی کو اس نئی سرزمین پہ "گمنام" کے نام سے اندراج کرا دیتی ہے۔ "جینے کی آرزو" کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا آدمی کے احساسات اور عورت اور مرد کی ازلی کشش سے متعلق ہے۔ افسانہ "بائی بشیر" نوبالغ لڑکوں میں ہم جنس پرستی اور مردانگی کے مروّجہ معیارات کی کش مکش کو بیان کرتا ہے۔ علاوہ ازیں افسانہ "بھیدی" میں جنسی اعتبار سے ایک ناخوش عورت کے دل کا بھید کھول کے پیش کیا گیا ہے۔ "ڈرپوک" ایک نڈر دوشیزہ اور ایک بزدل آدمی کے تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ "بڑی باجی" ہمارے معاشرے کا وہ کردار ہے جو متوسط طبقے میں پڑھی لکھی کمانے والی نوجوان لڑکیوں کو درپیش معاشی ناہمواریوں اور سماجی رویّوں کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ "فرار" ایک مرد کا بڑھاپے اور موت جیسی تلخ حقیقتوں سے فرار حاصل کر کے عورت میں پناہ لینے کی سعی کا بیان ہے۔ "اندیشہ" عورت کے بانجھ پن کے تدارک کے لیے کی گئی جدید طبی سہولیات کی ناکامی اور بنگالی بابا کے مشورے کو ردّ کرنے کی کش مکش ہے، تو "میڈم" کثرت ازدواج، عورت کی بکارت (virginity) اور دبی ہوئی جنسی خواہشات کے اظہار کی بابت ہے۔ افسانہ "چھوڑ دو" میں ازدواجی عصمت دری (marital rape) جیسے حساس موضوع کو بہت مہارت سے ایک مرد کے نقطۂ نگاہ سے پیش کیا گیا ہے، جس کو اپنے عمل کی کوتاہی کا ادراک نہیں۔ علاوہ ازیں "اے ٹی ایم" ایک بہت منفرد افسانہ ہے جو دورِ حاضر میں دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کے تجربات کی غمازی کرتا ہے۔ "آرٹسٹ" تلاش معاش، نام وری اور شوق کی راہ پہ چلنے والی نوجوان لڑکیوں کے پیشہ ورانہ جنسی استحصال کی کہانی ہے۔ "مٹھو" ہم جنس پرستی اور مرد و عورت کے عمروں کے تفاوت سے جنم لینے والی نفسیاتی کش مکش کی کہانی ہے۔ "انوکھا" غریب اور ضرورت مند عورتوں کے جنسی استحصال کی عکاسی کرتا ہے۔ "سوداگر" دولت کی خاطر والدین کے دباؤ میں آ کر کی جانے والی زبردستی کی شادی کے ایک مرد کی زندگی پر نتائج و عواقب سے متعلق ہے۔ "وائرس" ملازمت کرنے والی عورتوں کے مردوں سے سماجی روابط اور خواہشات کی پرداخت کی باریکیوں سے متعلق ہے۔ "نیادر" عورت کے بانجھ پن، بے جوڑ شادیوں، اور عنفوان شباب میں لڑکوں کی منہ زوری پہ مبنی ہے۔

تیسرے مجموعے پوٹلی کے موضوعات متنوّع ہیں"[۱۳]۔ افسانہ "صادو" دیہی علاقوں میں طاقت ور وڈیروں کے ہاتھوں غریب مزارعوں سے روا رکھے جانے والے غیر مساوی سلوک اور ان کی عورتوں کے جنسی استحصال سے متعلق ہے۔ بوٹی کا وڈیرے کے ہاتھوں اپنی بیوی کے اغوا اور عصمت دری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے "صادو" کو مقامی لوگوں اور معززین کے

دھتکارنے کے باوجود قبول کرنا ایک غریب ان پڑھ آدمی کی وسعت نظری اور صنفی حساسیت کی عکاسی کرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ افسانہ جنسی استحصال اور غربت کے باہمی عمیق ربط کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ مجموعہ پوٹلی کے بیش تر افسانے میاں بیوی کے باہمی مراسم اور چپقلش کی عکاسی کرتے ہیں، جن میں سر فہرست افسانہ ''پوٹلی'' ہے، جس میں ہمارے معاشرے کی عورت اپنے ازدواجی تعلقات میں گلوں و شکووں کی پوٹلیاں سینت سینت کر رکھتی دکھائی دیتی ہے، اور ان سے اپنی ذات کا تحفظ کرتی ہے، اور مختلف مراحل پہ ان پوٹلیوں کو گاہے بہ گاہے کھولتی دکھائی دیتی ہے۔ مرد و عورت کے باہمی ازدواجی تعلقات کی اس کش مکش کا اظہار ''دن رات''، ''کھوج''، ''لاک ڈاؤن'' جیسے افسانوں سے ہوتا ہے۔ افسانہ ''کم بخت'' بچیوں کی شادی میں باپ کی تنگ نظری اور بیمار سوچ کے حائل ہونے جیسے اہم موضوع سے متعلق ہے۔ افسانہ ''رجی پچی'' ایک گونگی بہری مگر خوددار طوائف کی کہانی ہے جو مرتے دم تک ایک روپیہ اور میٹھے پان سے زیادہ اجرت وصول نہیں کرتی، اور جسے خوشحال خان ''اپنی عورت'' قرار دیتا ہے۔ ''بجو نگڑا'' کا موضوع ہم جنس پرستی ہے، جس میں ہوس پرست بجو نگڑا اپنی بیوی کا سودا کرنے سے ہچکچاتا نہیں۔ علاوہ ازیں مصنف نے ہمارے معاشرے میں تیزی سے عود آنے والی مادیت پرستی، نفسا نفسی اور خود غرضی کو بھی موضوع بنایا ہے، جس کی بھینٹ فی زمانہ دوستی، مروّت اور محبت جیسے خوب صورت اور بے لوث رشتے چڑھ رہے ہیں۔ اس ضمن میں ''وجہ دوستی''، ''دوراہا'' اور ''خالی ہاتھ''، ''بھلکڑ'' اور ''تکڈم'' افسانے قابل توجہ ہیں۔ اکیسویں صدی میں کرّہ ارض کو اپنے چنگل میں لے لینے والے عفریت جسے کرونا فلو کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کی جھلک افسانہ ''پپونا'' میں ملتی ہے۔

منتخب افسانوں میں مندرجہ ذیل اہم تانیثی و صنفی موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے:

(الف) جنس، صنف اور جنسیت

خالد آفتاب کے افسانوں کا اہم موضوع پاکستان کے مخصوص ثقافتی و تہذیبی پس منظر میں جنس، صنف اور جنسیت کے غالب تصوّرات ہیں۔ بیش تر کہانیاں مرد و عورت کے باہمی جنسی تعلقات کے گرد گھومتی ہیں۔ تاہم ہم جنس پرستی کے گرد بھی کہانیاں بنی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں، نسائیت اور مردانگی کے تصوّرات کی پرداخت میں حیاتیاتی عناصر، سماجی اصول و ضوابط، اور تہذیب و تمدن کے اثرات کی مؤثر انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کہانیوں کے موضوعاتی تجزیے سے پہلے کچھ اہم صنفی تصوّرات کا ذکر کرنا مناسب ہو گا، جو درج ذیل ہیں۔

جنس (sex) دراصل مرد، عورت، یا بین جنسی کی حیاتیاتی تقسیم کا نام ہے یعنی ایک فرد اپنی جسمانی خصوصیات میں مرد، عورت یا ان ہر دو صورتوں سے ہٹ کر اپنی الگ جسمانی شناخت رکھتا ہے، جب کہ صنف فرد کی حیاتیاتی ساخت کی بنا پہ سماجی طور پہ تفویض کیے جانے والے کردار، اعمال، اظہار کے انداز، اور شناخت سے وابستہ ہے، جس کی رو سے ہم افراد کو مرد، عورت، یا

غیر ثنوی کے طور پہ شناخت کرتے ہیں۔ جنسی رجحان کے اعتبار سے ایک فرد مخالف جنس پرست، ہم جنس پرست، دُو جنسی ہو سکتا ہے۔ صنف کے یہ انفرادی تجربات صنفی شناخت کی صورت میں فرد کو عورت، مرد، غیر ثنوی (ایسی تقسیم جو فرد کو عورت یا آدمی کی شناخت نہ دے)، اور صنف کوئر (وہ صنفی شناخت جو نسوانیت یا مردانگی کے زمرے میں نہ آئے) میں تقسیم کرتے ہیں۔

صنفی کردار در حقیقت سماجی توقعات سے ترتیب پانے والے اس کردار اور طرز عمل کا نام ہے، جو ہر صنف سے کسی بھی معاشرے نے وابستہ کر رکھی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پہ بالعموم عورت کو دیکھ بھال کرنے والی اور خدمت گزار مخلوق کے طور پہ دیکھا جاتا ہے، جب کہ ایک مرد کو طاقت ور اور حکمران تصوّر کیا جاتا ہے۔ ہر صنف کے حوالے سے مخصوص دقیانوسی تصوّرات منسلک کر دیے جاتے ہیں، جن پہ پورا اترنے کی تگ و دو میں افراد اپنی شناخت کا عمل جاری رکھتے ہیں۔ کسی بھی سماج میں یہ صنفی تصوّرات و توقعات تاریخ کے مختلف مدارج میں مسلسل تکرار کرتے ہوئے سماجی صنفی اقدار بن جاتی ہیں۔ ایسا سماجی نظام جس میں عورت کم تر اور کم زور ہو جب کہ مرد کو فوقیت اور طاقت حاصل ہو، پدر سری نظام کہلاتا ہے۔ ماہرین نے اس حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے کہ آیا صنفی خصوصیات حیاتیاتی ہیں یا سماجی طور پر تعمیر کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں سمون دی بووا، جوڈتھ بٹلر کے مباحث اہم ہیں (جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے)۔ جنسیت کے حوالے سے میشل فوکو نے دریافت کیا کہ معاشرے طاقت، گفتگو اور اداروں کے ذریعے جنس اور جنسیت کو کیسے منظم کرتے ہیں [۱۴]۔ رے وَن کو نیل (Raewyn Connell۔پ:۱۹۴۴ء) نے متفرق مردانگی (multiple masculinities) کا تصوّر پیش کیا، اس کے نزدیک مردانگی کی مختلف صورتیں ہیں، جیسا کہ بالادست مردانگی (hegemonic masculinity)، شریک مردانگی (complicit masculinity)، ماتحت مردانگی (subordinated masculinity) اور پس ماندہ مردانگی (marginalized masculinity)۔ مردانگی کی یہ سب حالتیں مختلف ثقافت، سماجی گروہ، نسل، عمر اور جنسی رجحانات کے حوالے سے متغیر ہوتی ہیں، نہ کہ آفاقی اور پہلے سے طے شدہ۔ بالادست مردانگی سے مراد کسی خاص معاشرے میں مردانگی کی غالب اور سماجی طور پہ قابل قبول صورت ہے، جو مردانہ غلبہ کو جائز قرار دیتا ہے اور اکثر دوسری مردانگی اور نسائیت کو پس پشت ڈالتا ہے [۱۵]۔ کمبرلی کرین شا (Kimberlé Crenshaw۔پ:۱۹۵۹ء) ایک سیاہ فام ماہر حقوقِ نسواں نے ۱۹۸۹ء میں بین جنسیت (Intersexuality) کا تصوّر پیش کیا تھا اور بیان کیا کہ کس طرح سیاہ فام خواتین کے تجربات کو حقوق نسواں اور نسل پرستی کے مخالف دونوں تحریکوں کے ذریعے نظر انداز کیا جاتا رہا۔ بین جنسیت ایک ایسا تصوّر ہے جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد کرتا ہے کہ کس طرح تفریق اور استحقاق کی مختلف شکلیں آپس میں جڑی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھتا ہے کہ کس طرح لوگوں کی متعدد شناختیں جیسے جنس، طبقات، جنسیت، مذہب، معذوری وغیرہ ان کے جبر یا مفاد کے تجربات کو شکل دینے کے لیے باہم متصل ہیں [۱۶]۔

ان نظریات کی روشنی میں جب خالد آفتاب کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو پاکستانی معاشرے میں عورت اور مرد کے

باہمی تعلقات، خواہشات اور آدرشوں کے بارے میں چشم کشا حقائق سامنے آتے ہیں۔ مصنف نے اپنے افسانوں میں اس بات کی تائید کی ہے کہ قطع نظر حیاتیاتی تقسیم کے مرد اور عورت دونوں ہی مساوی جنسی رغبت رکھتے ہیں، عورت بھی اپنی جنسی ضروریات کی تشفی کی اتنی ہی طلب گار ہوتی ہے جتنا کہ ایک مرد۔ تاہم ہماری سماجی روایات، سوچ کا روایتی انداز اور سماجی قدریں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ عورت اپنے جذبات و احساسات، اور جنسی ضروریات کا برملا اظہار کر سکے۔ افسانہ ''ڈرپوک'' کی تنو، ''میڈم'' کی تابندہ، ''وائرس'' کی ماجدہ اور ''نقاب'' کی گمنام لڑکی ایسے ہی نڈر تانیثی کردار ہیں، جو اپنی جنسی خواہشات اور صنف مخالف میں فطری کشش کے نتیجے میں مرد کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں اور اپنے جذبات و احساسات کا پراعتماد انداز میں اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی عورت نڈر اور بے باک ہے۔ جب افسانہ ''ڈرپوک'' میں نوبالغ نواز اپنی کزن تنو کی پیش قدمی پر اسے کہتا ہے کہ کیا اسے ڈر نہیں لگتا، تو وہ پلٹ کر بے ساختہ کہتی ہے: ''نہیں، تم مرد ہو اور پھر بھی ڈرتے ہو؟[۱۷]'' اس افسانے میں عورت کے فطری احساسات کی نشان دہی کرتے ہوئے اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اپنے جسمانی تقاضوں کی تشفی کی راہ میں ایک نوجوان لڑکی جرأت مند اور لڑکا ڈرپوک اور جھجک کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ یہ افسانہ جہاں جنسی خواہشات کے اظہار میں صنفی تقسیم کی نفی کرتا ہے، وہاں ہمارے معاشرے میں رائج مردانگی کے غالب تصوّرات کی عکاسی بھی کرتا ہے، جو عورت کی نگاہ میں مردانگی کو مرد کی جنسی بالادستی کا جوہر قرار دیتی ہے۔ خود مرد بھی اپنی مردانگی کو جنسیت کی کسوٹی پہ پرکھتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پہ افسانہ ''فرار'' میں ادھیڑ عمری میں بڑھاپا اور موت کے خوف کا شکار ہونے والے دوستوں کے درمیان ہونے والی گفتگو میں مردوں کا جنس کو مردانگی کے مترادف سمجھ کر عورت کی قربت میں پناہ لینے کے رجحان کی عکاسی کی گئی ہے۔ دوستوں کو چھوڑ کر کافی لاؤنج میں آنے والی خوب صورت عورت کی طرف راغب ہونے والے حبیب اللہ کا کہنا تھا:

> کچھ بھی ہو، ہمیں تو زندگی سے پیار ہے۔ میں اس سے فرار نہیں چاہتا۔ جو بھی زندگی سے پرے بھاگتا ہے، اسے بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ ہر انسان کو فطرت کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزرانی چاہیے.....جو لوگ فطرت سے ہٹ کر اپنی الگ شناخت قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں، وہ منہ کے بل گرتے ہیں۔[۱۸]

ہمارے ہاں مروجہ مردانگی کا تصوّر اس سماجی تربیت کا عکاس ہے جس میں مرد کو جارحیت پسند، جنسی پیش قدمی کرنے والا پراعتماد اور نڈر انسان بننے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ افسانہ 'جینے کی آرزو' میں کینسر کی جان لیوا بیماری میں مبتلا شخص بیماری اور موت سے وابستہ خوف کو مردانگی کے رائج انھی تصوّرات کی مدد سے شکست دینے کی کوشش کرتا دکھائی دیتا ہے:

> غالباً خود کو ایک مضبوط اور نڈر آدمی منوانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے کسی کے سامنے اپنے خوف کا اظہار نہیں کرتا![۱۹]

اپنی انا، اور تصوّر ذات اور مردانگی کے تحفظ کی خواہش کا احساس ایک مرد کو اپنی زندگی میں آنے والے امتحانات کا مقابلہ

"مردانہ وار" کرنے کی ترغیب دیتا ہے، کیوں کہ تحقیق بتاتی ہے کہ صنفی سماجیات (جینڈر سوشلائزیشن) کا عمل پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے جب خاندان کے افراد لڑکوں اور لڑکیوں کو زبان، توقعات اور ڈسپلن کے حوالے سے مختلف انداز سے پروان چڑھاتے ہیں[۲۰]۔

مصنف نے ہمارے معاشرے میں جنس سے وابستہ مرد کے کردار و توقعات، نوبالغ لڑکوں کی جنسی تربیت کے فقدان، گھٹن زدہ سماجی ماحول کے ان کی خود اعتمادی پہ اثرات، اور جنسی بے راہ روی میں دوستوں کی صحبت کا اثر جیسے مسائل پہ توجہ مبذول کروائی ہے۔ افسانہ "بائی بشیر" کا نوجوان رازی ایسے ہی دباؤ کا شکار ہو کر اپنے دوست کی تجویز پہ اپنی مردانگی کی توثیق کے لیے لیڈی ڈاکٹر کے کلینک کا رخ کرتا ہے۔ منتخب افسانوں کے اقتباسات پیش ہیں:

> نہ جانے پاکستان میں مرد، عورت سے کتنا دور رہتے ہیں کہ ان کی جنسی بھوک کی شدت قحط زدہ انسانوں جیسی ہے![۲۱]
>
> میں کسی اور لڑکی سے کہہ دوں گی کہ ذرا اس چغد کی تسلی کروادے کہ وہ واقعی ایک مرد ہے۔[۲۲]

مردانگی کے ان تصوّرات پہ پورا اترنے کی تگ و دو میں بہت سے مرد ایسی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں، جن کا سرا ان کے ہاتھ نہیں آتا۔ افسانہ "چھوڑ دو" کا گوگی بٹ یہ جاننے سے قاصر تھا کہ اس کی بیوی روزی نے اس کا ہاتھ کیوں جھٹک دیا، کیا وہ اس کا مردانہ تھا! اور افسانہ "بس" کے کیپٹن آثم نے کیوں شادی کی رات "بس" کہنے پہ اپنی بیوی کو میکے بھجوا دیا۔

جہاں مردانگی کی پرداخت پہ بات کی گئی ہے، وہاں عورت کے تصوّر اور اس سے وابستہ توقعات اور تصوّرات کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ بیش تر افسانوں میں نسائیت سے جڑے تصوّرات روایتی طور پہ عورت کی خوب صورتی، جوانی، اور جنسی کشش سے منسلک ہیں، جو اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پاکستانی معاشرے میں عورت کو آج بھی جسمانی خوب صورتی، خدّوخال اور شرم و حیا کی چادر میں لپیٹ کر رکھا جاتا ہے۔ مرد کی جنسی رغبت کو عورت کے حسن و جمال، جسمانی خدوخال، اور جنسی کشش سے جوڑا گیا ہے، جس کا اظہار، "بھیدی"، "چھوڑ دو" اور "بے بس" جیسے افسانوں میں بالخصوص نظر آتا ہے۔

> روزی کی آنکھوں کی چمک، رخساروں کی فطرتی جاذبیت، چہرے کی دل پذیر مسکراہٹ اور بھری جوانی کا طلسم ایمان شکن تھا۔[۲۳]

تاہم، مصنف نے یہ بھی باور کرایا ہے کہ آج کی عورت مرد کی جسمانی وضع قطع پر ایسے ہی سوچ بچار کرتی اور اظہار رائے کرتی ہے، جیسا کہ مرد اس کو جسمانی خدّوخال اور جنسی کشش سے پرکھتا چلا آیا ہے۔۔ مثال کے طور پہ افسانہ "بے بس" کی مرکزی کردار فرزانہ اپنے عمر رسیدہ شوہر کی بابت کہتی ہے:

> شادی کے دن مجھے کہنے لگا، مجھے صرف جوان عورتیں پسند ہیں۔ تمھارے جیسی خوب صورت جسم والی عورتیں۔

مجھے ڈھلکا ہوا جسم برا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمام بے ڈھبی عورتوں کو گولی مار دوں۔ اور اپنا یہ حال ہے کہ اس کی توند لٹک کر مٹکا بن چکی ہے۔[۲۴]

خالد آفتاب کے افسانوں کا ایک اہم موضوع کنوار پن اور اس سے وابستہ خیالات و رجحانات ہیں۔ عصرِ حاضر میں کنوار پن کے روایتی تصوّرات کو پڑھی لکھی اور معاشی طور پر خود کفیل عورتوں کے مختلف کرداروں کے توسط سے چیلنج کیا گیا ہے۔ افسانہ ''اے ٹی ایم'' میں جب عذرا اپنی دوست سے پوچھتی ہے کہ ہمارے کلچر میں لڑکیوں کے کنوار پن پہ اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے، جس کے جواب میں رابعہ بے ساختہ کہتی ہے:

اس لیے کہ عملی زندگی میں بیش تر مرد کنوارے نہیں ہوتے۔ بس ایسا تصوّر کیے جاتے ہیں۔ البتہ ان کے ذہن میں کنوار پن کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ یعنی کہ مردوں کو سو گناہ معاف ہیں اور عورتوں کی کوئی خطا بھی نہیں، مگر ایک بات اور بھی ہے، جب سے عورتیں معاشی طور پر آزاد ہوئی ہیں، کنوار پن کی پہلے جیسی اہمیت نہیں رہی۔ کھاتی پیتی اور صاحبِ حیثیت عورتوں کے لیے پسند اور ناپسند کا اب اور ہی پیمانہ ہے۔[۲۵]

افسانہ ''میڈم'' کی تابندہ ایک پڑھی لکھی اور آزاد خیال خاتون ہے جو شادی کی رات اپنے شوہر سے کنوار پن اور جنسی تسکین جیسے مسائل پر کھل کر بات کرتی ہے۔ سہاگ رات کو حاجی صاحب نے بتایا کہ عرب معاشرے میں لڑکی کا باکرہ ہونا بہت اہمیت کا حامل ہے، اور لڑکی کا باکرہ نہ ہونا گویا اس رقم کا ضائع ہونا ہے جو مرد نے دُلھن کے والدین کو ادا کی تھی۔ بعد ازاں جب حاجی صاحب تابندہ سے یقین دہانی چاہتے ہیں کہ: ''آپ بھی تو ایسی ہیں!'' اس پہ تابندہ پلٹ کر حاجی صاحب سے سوال کرتی ہے کہ ''کیا وہ بھی ایسے ہیں!!''[۲۶]۔

اگرچہ مصنف نے عورت کو باشعور اور پر اعتماد دکھایا ہے، تاہم عملی زندگی میں ایسی مثالیں خال خال ہیں۔ عمومی طور پہ عورت کا آدمی سے ان موضوعات پہ کھل کا بات کرنا اس کی پاکیزگی پہ سوال اٹھاتا ہے۔ تاہم ہمارے معاشرے میں مرد کے لیے کنوار پن کی کوئی اہمیت نہیں، بلکہ مردانگی کا تصوّر جنسی تجربات کی رنگا رنگی، اور جنسی کارکردگی سے وابستہ کیا جاتا ہے (افسانہ 'بس')، حتیٰ کہ مرد، جنسی ناتجربہ کاری پر دوسرے مردوں کا مذاق اڑاتے اور تنقید و تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں (افسانہ 'فرار'، 'اندھا دھند')۔ مردانگی کو جنسی استعداد و قابلیت اور عورت کو جنسی اعتبار سے مطمئن کرنے کی صلاحیت کے مساوی قرار دیا جاتا ہے، اس لیے ایک مرد اپنے کنوار پن کو نوبلوغت میں ہی کھو دینے کے دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے، جس کا اظہار غیر صحت مندانہ اور جارحانہ جنسی کردار اپنا لینے کی صورت میں نکلتا ہے[۲۷]۔ بالعموم کنوار پن کو عورت کی خصوصیت اور قدر و قیمت کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور روایتی طور پہ ایک پدرسری معاشرے میں عورت کے کنوار پن کو خاندان کی شہرت، ناموس اور عزت سے منسلک کیا جاتا ہے۔ لہٰذا عورت اپنی جنسی خواہشات اور معاشرتی معیارات میں توازن قائم کرنے کی کش مکش کا شکار رہتی ہے[۲۸]۔ خاندان، دیگر سماجی ادارے اور معاشرتی

اقدار و روایات لڑکیوں کی تربیت میں ان کے جذبات و احساسات اور خواہشات کو قابو کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم مصنف کے نزدیک سماجی رسومات، بشمول پردے کا رواج جوان لڑکیوں اور عورتوں کی جنسی ترغیبات پہ قدغن لگانے سے قاصر ہیں۔ افسانہ ''نقاب'' ملتان کے متوسط آمدنی والے لوگوں کے محلے کی ایک نقاب پوش دوشیزہ کی کہانی ہے جو کمال کے ساتھ سینما میں فلم دیکھنے کی خواہش مند بھی ہوتی ہے اور سینما ہال میں بیٹھ کر لطف و پیار کا اظہار کرتی ہے مگر اپنا نقاب نہیں الٹتی اور نہ کمال کو نقاب ہٹانے کی اجازت دیتی ہے۔ کمال کے لیے یہ حیران کن بات ہے۔ اس کے استفسار پہ نقاب پوش لڑکی کا یہ کہنا تھا:

> نہیں، شادی سے پہلے کسی نامحرم مرد کو اپنا چہرہ دکھلانا بدشگونی کا سبب بنتا ہے۔ آپ مجھے ایسا کرنے کے لیے اصرار نہ کریں... اسے میری مجبوری سمجھیں، جب تک شادی نہیں ہو جاتی، میری شناخت میرا نقاب ہو گا۔[۲۹]

یہ افسانہ معاشرے میں جنم لینے والے اس تضاد کی عکاسی کرتا ہے، جو نقاب کی صورت میں لڑکیوں کو جبلی خواہشات اور اپنی شناخت چھپانے کے لیے سماجی طور پہ قابل قبول طریق کو اپنانے اور ایک مکھوٹا اوڑھ لینے کی ترغیب دیتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ جس تضاد کا شکار ہے، مصنف نے کمال مہارت سے اس معاشرتی کجی کو بے نقاب کیا ہے۔ پردے کا تصوّر ہمارے معاشرے میں عزت کے تصوّر (honor) کے ساتھ جڑا ہے، ایک عورت کے صنفی کردار اور جنسیت کا تعلق ایک خاندان کی غیرت اور ساکھ کے ساتھ جوڑا جاتا ہے، جس کی خلاف ورزی کو خاندان کی عزت کے لیے ایک خطرے کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ صنفی علوم کے ماہرین عورت اور مرد کے مروّجہ کرداروں اور تصوّارت کو سماجی ڈھانچوں کے ساتھ منسلک کرتے ہیں۔ افراد، بشمول مرد اور عورت کی جنسی تخصیص اور حیاتیاتی تقسیم کی بنیاد پہ ان کے لیے سماجی صنفی کرداروں کا تعیّن کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں افراد اپنی صنفی شناخت کرتے ہیں، اور ان کے جنسی رجحانات، جنسی رغبت اور شناخت و جنسی اعمال کا تعلق ان کی جنسی شناخت سے جڑا ہوتا ہے۔ ایک فرد ہم جنس پرست ہے یا صنفِ مخالف میں دل چسپی و کشش رکھتا ہے، اس کا دارومدار اس کی جنسی شناخت پر ہے، اور جنسی شناخت کی پرداخت، صنفی شناخت کے عمل سے متصل ہے۔ جوڈتھ بٹلر اپنی کتاب *Gender Trouble* (۱۹۹۰ء) میں صنف (gender) کے جبلی یا اختیاری عمل کے معاملے پہ بحث کرتے ہوئے، صنف کو ایک اختیاری عمل قرار دیتی ہے جس کے سوتے سماجی معیارات اور بار بار انجام دیے جانے والے انسانی کردار (performativity) سے جوڑتی ہے۔ ایسے تواتر سے انجام دیے جانے والے اعمال فطرت ثانیہ بن جاتے ہیں[۳۰]۔ مصنف نے پاکستان میں LGBTQ افراد (ہم جنس پرست، ذو جنسی، ٹرانس جینڈر، کوئر) کی بابت ''بائی بشیر''، ''مٹھو''، ''بچو نگڑا'' جیسے افسانے رقم کیے ہیں۔ میشل فوکو (Michel Foucault، ۱۹۲۶ء-۱۹۸۴ء) نے اپنی کتاب جنسیت کی تاریخ (*The History of Sexuality*، ۱۹۷۶ء) میں اس بات کی وکالت کی ہے کہ جنسیت کا مظہر اٹھارویں اور انیسویں صدیوں سے زیرِ تسلط ہے، خاص طور پر قانون، طب اور مذہبی علوم کے فروغ نے جنسیت کے محدود اور مقید تصوّر کی

پر داخت کی ہے۔ جب کہ قدیم یونان اور روم میں جنسیت کا تعلق فرد کے سماجی مرتبے سے منسلک تھا، نہ کہ اس کی جسمانی و جنسی شناخت سے، تاہم عیسائیت کے فروغ نے جنسیت کو قابلِ ضبط سرگرمی اور مروّجہ جنسی مراسم سے ہٹ کر قائم کردہ جنسی روابط کو قابلِ سرزش اور قابل تعزیر قرار دیا۔ جب کہ اسلامی معاشروں میں مذہبی قوانین، افراد معاشرہ کے جنسی کردار و اعمال کی تنظیم کرتے ہیں۔ جنس اور صنفی کرداروں کی طرح جنسیت بھی ایک سماجی تشکیل ہے، یہ صرف حیاتیاتی نہیں ہے[۳۱]۔ بیسویں صدی میں پروان چڑھنے والی حقوقِ نسواں، LGBTQ تحاریک اور فرائیڈ (Sigmund Freud۔۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء) جیسے ماہرین کی تحقیق نے جنس اور جنسی تعلقات کے محدود تصوّرات پہ سوال اٹھائے اور اس کو وسیع تناظر میں پرکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

(ب) شادی کا ادارہ اور عصری صنفی مسائل

شادی ایک سماجی ادارہ ہے، جو کسی بھی معاشرے میں غالب صنفی اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ بٹلر کے نزدیک شادی خواتین کے مردوں پہ انحصار کو مستحکم کرتی ہے اور اکثر خواتین کی خود مختاری کو محدود کرتی ہے[۳۲]۔ شادی میں مردانگی اور نسائیت سے وابستہ ثقافتی توقعات مرد اور عورت کے ازدواجی کرداروں پہ اثرانداز ہوتی ہیں۔ کونیل کے نزدیک بیش تر معاشروں میں آدمی سے توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ فیصلہ سازی کرے اور خاندان کی معاشی کفالت کی ذمہ داری اٹھائے اور عورت خاندان کی دیکھ بھال کا فریضہ انجام دے۔ درحقیقت صنفی کرداروں کی یہ تقسیم طاقت کی حرکیات پہ اثرانداز ہوتی ہے اور ازدواجی زندگی میں غیر مساوی ذمہ داریوں اور اختیارات کا باعث بنتی ہیں[۳۳]۔ خالد آفتاب نے مرد و عورت کے شادی سے وابستہ تصوّرات اور میاں بیوی کے باہمی مراسم، اندازِ گفت و شنید اور اس سے جنم لینے والی تلخیوں کو موضوع بنایا ہے۔ علاوہ ازیں کثرتِ ازواج، نوعمری کی شادی، جبری شادی، اور غیر ازدواجی تعلقات اور مرد کی نامردی اور عورت کے بانجھ پن جیسے مسائل اور ان سے جڑے سماجی رویوں، طور طریقوں اور رسوم و رواج کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔

ہمارے معاشرے میں عورت اور مرد کے شادی کے متعلق انفرادی تصوّرات اور خیالات ہیں۔ مصنف نے شادی اور ازدواجی زندگی کے بارے میں مرد و عورت کے مخصوص اندازِ فکر میں تفریق اور ناقص تصوّرات کے حوالے سے اہم سوالات اٹھائے ہیں:

> ہمارے ہاں آدمی اور عورت پیار کی بابت اپنے اپنے تصوّر میں کتنی مختلف دنیائیں آباد کرتے ہیں اور ستم یہ ہے کہ ایک دوسرے سے اپنا حالِ دل کہنے سے بھی کتراتے ہیں۔ یوں اکثر اندوہ ناک فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔[۳۴]

میاں بیوی کے رشتے کی نزاکت اور لطافت کے اسرار اور ان کا جنسی زندگی سے تعلق، افسانہ "ورولا" میں مسرور شاہ کی زبانی کچھ یوں بیان ہوتا ہے:

شادی شدہ زندگی کے کئی دور ہوتے ہیں۔ پہلا دور جنونی قسم کا ہوتا ہے.....اس کے بعد خطوط وحدانی دور شروع ہوتا ہے۔ عورت اور مرد دونوں ہی ضبط اور احتیاط سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اس وقت اظہارِ جذبات کی شدت سے گریز کا آغاز ہوتا ہے.... عقل، دور اندیشی اور ذاتی مفاد کے پردے آہستہ آہستہ سچے جذبات کو لپیٹنے لگتے ہیں..... تیسرا دور جب جنسی زندگی ٹاپ گئیر سے نیچے آکر فرسٹ گئیر میں آجائے اور جلد نیوٹرل گئیر میں آکر رک جائے۔[۳۵]

اگرچہ میاں بیوی دونوں ہی ان ادوار سے گزرتے ہیں، تاہم مصنف کے نزدیک جنسی تشفی کی عدم تسکین کے نتیجے میں ایک عورت بھی ذہنی کرب سے اسی طرح گزرتی ہے، جیسا کہ ایک آدمی۔ اس حقیقت کا اظہار خالد آفتاب کے کئی افسانوں میں مختلف نسوانی کرداروں کی زبان میں کیا گیا ہے۔ جب ''لاک ڈاؤن'' میں عائشہ کی ساس اس کو شوہر کی بے رغبتی پہ خود پیش قدمی کرنے کی ترغیب دیتی ہے تو وہ غصے سے تمتماتے ہوئے بولی:

سنیں خالہ جی، آپ کا بیٹا سوکھا ہوا کیکر ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس میں نمی ختم ہو چکی ہے۔ بھلا کملائے ہوئے پودے میں پھول کیسے آئیں گے ؟[۳۶]

جدید افسانے میں میاں بیوی کے باہمی تعلقات پہ بہت کم قلم اٹھایا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ان تعلقات کو بہت ذاتی اور نجی معاملہ خیال کیا جاتا ہے، ایسے میں خالد آفتاب نے نہ صرف میاں بیوی کے باہمی تعلقات پہ چھائی خاموشی کو زبان دی ہے، بلکہ مرد و عورت دونوں کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ خالد آفتاب کے افسانوں میں میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کے نازک پہلوؤں اور پیچیدگیوں تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ شادی کی صنفی حرکیات کا تعلق اس امر سے ہے کہ صنفی کردار، توقعات اور طاقت کے مروجہ ڈھانچے، کیوں کر میاں بیوی کے درمیان روابط، تعلقات اور معاملات کی تشکیل کرتے ہیں۔ باہمی ازدواجی تعلقات کی حرکیات غالب اور وسیع صنفی اقدار اور سماجیات سے تشکیل پاتے ہیں۔ مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ مساوی کردار (egalitarian roles) پہ مبنی شادیوں میں زیادہ اطمینان اور تنازعات کی سطح کم ہوتی ہے[۳۷]۔ جب کہ صنفی تفریق پہ مبنی ازدواجی تعلقات تشدد اور جذباتی استحصال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں[۳۸]۔ پاکستان ایک طرف روایتی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف دنیا بھر میں ہونے والی سماجی و مادی تبدیلیوں کے زیر اثر موجودہ سماجی ڈھانچے توڑ پھوڑ کا شکار ہیں۔ خالد آفتاب کے افسانوں میں شادی اور ازدواجی تعلقات سے منسلک روایتی تصوّرات اور میاں بیوی کے باہمی مراسم میں در آنے والے غیر روایتی طرز فکر و عمل کی عکاسی ہوتی ہے۔ افسانہ ''پوٹلی'' کی گوشی اس بات سے نالاں تھی کہ خالہ رشیدہ نے رشتہ طے کرتے وقت ناصر کی عمر کم کیوں بتائی تھی۔ جب ناصر اس کو جتلاتا ہے کہ اب ایسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا، تو گوشی تلملا کر کہتی ہے:

فرق پڑتا ہے، بلاشبہ پڑتا ہے، اگر تم ساٹھ برس کے ہوتے تو مجھ سے دور رہنے کی کوشش نہ کرتے۔ اب تم

ستر برس سے اوپر ہو تو بیوی سے کنارہ کشی ہی کرو گے نا؟ یہ کوئی معمولی بات ہے؟[۳۹]

افسانہ ''کھوج'' کی شاہینہ اپنے خاوند اظہار شاہ کے اکسانے پہ اس سے شکوہ کناں ہوتی ہے:

> تو سنو، تم ایک نامرد قسم کے خاوند ہو۔ اپنی بیوی سے دور بھاگتے ہو، پر اِدھر اُدھر منہ مارتے پھرتے ہو۔ کیا تمھیں شرم نہیں آتی؟[۴۰]

ان تمام امثال میں مرد کی جنسی طاقت اور جنسی کارکردگی کو مردانگی سے جوڑا گیا ہے، جس کی ترویج سماجی تربیت کے عمل میں مسلسل دیے جانے والے پیغامات کے ذریعے کی جاتی ہے۔ تانیثیت پسند محققین کے نزدیک مردانہ طاقت، بالخصوص بالادست مردانگی کو مردانہ ثقافتوں میں مرد کی شناخت کے لیے مرکزی حیثیت دی گئی ہے[۴۱]۔ ان سماجی تصوّرات اور روایتی صنفی جنسی توقعات پہ پورا نہ اترنے کے سبب ایک مرد کو ان سماجی صنفی پیغامات کو سننا اور ان پہ عمل کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے تاکہ وہ اپنے سماجی رتبہ کو بحال رکھ سکے، جس کی تائید پدرسری نظام کے تمام ادارے کرتے ہیں[۴۲]۔ پدرسری معاشروں میں ایسے جنسی دباؤ کا نتیجہ عوامی سطح پہ شرمندگی، خانگی زندگی کی ناکامی اور بیوی کے طنز و تعریض اور علیٰحدگی کی صورت میں نکلتا ہے ان توقعات پہ پورا نہ اترنے کا نتیجہ نفسیاتی دباؤ، اضطراب اور ڈپریشن جیسے ذہنی عوارض، سماجی ملامت یا بیوی کی طرف سے روا رکھے جانے والے جارحانہ رویّوں کی صورت میں نکلتا ہے[۴۳]۔ اس کا اثر میاں بیوی کے درمیان ناہموار تعلقات کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت اپنے ان ذاتی دکھوں اور جنسی تشفی نہ ہونے کی تکلیف کے اظہار کے لیے شکووں کی پوٹلیوں کو نفسیاتی دفاعی طریقۂ کار کے طور پہ استعمال کرتی دکھائی دیتی ہے۔ افسانہ ''پوٹلی'' میں جب ناصر اپنی بیوی گوشی کے بڑھتے ہوئے گلے شکووں کو دور کرنے اور اس کی دل جوئی کی خاطر اس کو اپنے سب اعتراضات اور شکووں کو بیان کرنے کی ترغیب دیتا ہے تو گوشی اپنا مؤقف ان الفاظ میں بیان کرتی ہے:

> اگر سب پوٹلیاں کھول کر تمھارے سامنے رکھ دیں تو میرے ہاتھ خالی رہ جائیں گے اور میں اپنا کل سرمایہ گنوا دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔[۴۴]

ازدواجی تعلقات اور باہمی مراسم پہ بیش تر کہانیاں (مثال کے طور پر ''دن رات''، ''پوٹلی''، ''کھوج''، ''کمبخت'') ادھیڑ عمر میاں بیوی کے معاملات کے گرد بنی گئی ہیں۔ ایک عورت کو ادھیڑ عمری میں اپنے شوہر سے برملا، ہر بات کرتے اور گلے شکوے کرتے دکھایا گیا ہے، جو عمر کے ساتھ عورت کے باشعور فرد اور اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کے باہمی تعلق کی نشان دہی کرتا ہے۔ تحقیقات نے عورت کی بڑھتی ہوئی عمر اور فیصلہ سازی کے عمل میں اس کی ابھرتی آواز اور موقف کے باہمی ربط کی تائید کی ہے[۴۵]۔

مرد کی جنسی اہلیت کی طرح عورت کا تولید کی صلاحیت سے محروم ہونا بھی سماجی داغ سے منسلک ہے۔ افسانہ ''اندیشہ'' کی فرزانہ کو جب اپنے بانجھ پن کا علم ہوتا ہے تو وہ کبھی مزارات پہ جاتی ہے، کبھی بنگالی بابا کے پاس تعویز کے لیے اور بالآخر آئی وی

الیف کے جدید علاج کو اپناتی ہے۔ تاہم اس علاج میں ناکامی کی صورت میں نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ اس کو بنگالی بابا کی بات مان لینی چاہیے تھی[۴۶]۔ اس افسانے میں پاکستانی عورتوں کے تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اولاد کی خاطر دقیانوسی خیالات اور نقصان دہ سماجی طور طریقوں کو اپنانے کے رجحان کی نشان دہی کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں، کثرت ازواج کے موضوع کا احاطہ بھی کیا گیا ہے، اس حوالے سے پاکستانی مرد کی مختلف توجیہات کی امثال کچھ یوں ہیں:

> دیکھو عالم جان، ایک منکوحہ پہلے ہی گھر میں موجود ہے، میں نے کیا منکوحہ عورتوں کا فارم بنانا ہے؟ یہ شرط نا منظور ہے، مجھے عورت چاہیے، بیوی نہیں[۴۷]۔
>
> اپنی بیوی کی بابت میں سب سنبھال لوں گا کہ ہم سچے ایمان پہ کاربند لوگ ہیں، اور کیوں کہ آپ خود کماتی ہو، سو میرا دوسرا گھر بغیر کسی دشواری کے آباد ہو جائے گا اور اللہ کے ہاں بھی سرخ رُو ہو جاؤں گا[۴۸]۔
>
> میں عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں نے اپنی بیوی کو صاف بتا دیا ہے کہ اگر وہ مجھے ایک اور سمارٹ سی بیوی ڈھونڈ دے تو بے شک ملک واپس چلی جائے..... سچ یہ ہے کہ گناہ کرنے کی بجائے اپنی شرعی بیوی سے تعلق رکھنا بہتر ہے۔ اس لیے مجھے درمیانی عمر کی کنواری، سنجیدہ، اور پڑھی لکھی عورت کی تلاش ہے[۴۹]۔

مصنف کے نزدیک ہمارے معاشرے میں دولت کی فراوانی، مذہب کی آڑ اور عورت کا معاشی طور پہ خود کفیل ہونا، دوسری شادی یا ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا محرک ہے۔ اسلامی ممالک، بشمول پاکستان کے، مرد کا ایک سے زیادہ شادیاں کرنا، ایسے ہی ہے جیسے اس کا اپنی جائیداد میں اضافہ کرنا ہے، بقول افسانہ "بے بس" کی فرزانہ کے:

> سندھ میں ہر کھاتے پیتے مرد کی دو تین بیویاں ضرور ہوتی ہیں.... جو دو تین بیویوں کو کھانا کھلا سکے، چاہے ان کے دوسرے حقوق پورے نہ ہوں! ہمارے ہاں گھٹیا قسم کی ثقافت اور مسخ شدہ معاشرتی اقدار رائج ہیں[۵۰]۔

یہ رسوم و رواج اور روایات عورتوں کے بنیادی حقوق کو سلب کرنے کا باعث ہیں، اور عورت کی حیثیت ایک استعمال کی شے سے زیادہ نہیں تصوّر کی جاتی، جسے معاشی استعداد ہونے کے عوض خریدا جا سکتا ہے۔ اس خرید و فروخت کو شادی کا نام دے کر سماجی تائید حاصل کی جاتی ہے۔ تحقیق کے مطابق تعدد ازدواج کے افراد کے باہمی تعلقات اور ان کی سماجی اور رومانوی زندگیوں پہ منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں[۵۱]۔

ہمارے ہاں ایک اہم مسئلہ لڑکیوں کی کم عمری کی شادی ہے۔ تحقیق کے مطابق کم عمری کی شادی میں نہ صرف بچیوں کو چھوٹی عمر میں زچگی کے مراحل سے گزرنا پڑتا اور ان کی تعلیم میں خلل پڑتا ہے، بلکہ ان کے لیے گھریلو تشدد کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، وہ فیصلہ سازی کے عمل سے خارج ہو جاتی ہیں، اور اپنی ذات کی ترقی اور خاندان کی ترقی کے حوالے سے آواز اٹھانے سے محروم

ہو جاتی ہیں[۵۲]۔

اس ضمن میں ماؤں کی روایتی سوچ کا اظہار افسانہ ''بے بس'' میں ہوتا ہے:

> ہمارے پرانے گھرانے سمجھتے تھے کہ جوان لڑکی کا اپنے ماں باپ کے گھر میں رہنا نحوست ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں لڑکوں کی مائیں کم عمر لڑکیوں کو پسند کرتی ہیں۔ تصوّر یہ کیا جاتا ہے کہ کم عمر لڑکی موم کی گڑیا کی طرح ہوتی ہے، جدھر چاہو ادھر موڑلو۔ جیسے ہی بیس برس کی ہوئی، پھر کسی کی نہیں سنتی[۵۳]۔

ہمارے سماج میں ایسے بے جوڑ رشتے بالعموم ماؤں کی رضامندی سے طے پاتے ہیں اور اس میں قباحت محسوس نہیں کی جاتی۔

> "میری بیٹی بھی دھیرے دھیرے ان امور سے واقف ہو جائے گی اور اس کی زندگی کی گاڑی چل پڑے گی، بالکل ویسے ہی جیسے اور لاکھوں کروڑوں عورتیں اپنی اپنی گاڑی کو چلاتی ہیں، چاہے ان کی گاڑی دھکا اسٹارٹ ہی ہو۔ زندگی کی گاڑی جوں جوں پرانی ہوتی جاتی ہے اور زیادہ دھکے مارتی ہے، ستم یہ تھا کہ ملک جی کی گاڑی تو شروع سے ہی دھکا سٹارٹ تھی[۵۴]۔

ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی کم عمری کی شادی در حقیقت ان کے جنسیت اور جسم پہ اختیار کی عملی مثال ہے، جس کا مقصد خاندان کی عزت کو محفوظ رکھنا ہے۔ کم عمری کی شادی کے جسمانی، سماجی، نفسیاتی اور معاشی نتائج بہت گھمبیر ہیں[۵۵]۔ عمروں کے وسیع تفاوت پر مبنی یہ رشتے بالعموم متوازن نہیں ہوتے۔ بالعموم مائیں ہی اپنی بیٹیوں کو ناہموار شادیوں کی ترغیب دیتی ہیں۔ مائیں غیر ارادی طور پہ روایتی صنفی اقدار کی ترسیل کرتی ہیں، اور پدر سری نظام در حقیقت مدر سری نظام سے تقویت پاتا ہے[۵۶]۔ ہمارے ملک میں ایسی بے جوڑ اور نو عمری کی شادیوں سے بہت سے المیے جنم لیتے ہیں۔

پاکستانی معاشرے میں زبردستی کی شادی ایک اہم معاملہ ہے، نہ صرف لڑکیوں کی شادی برخلاف مرضی کی جاتی ہے بلکہ لڑکوں کو بھی ماں باپ اور خاندان اپنی خواہشات اور تصوّرات کی بھینٹ چڑھانے سے گریز نہیں کرتے۔ اس ضمن میں افسانہ ''سوداگر''، ''سایہ''، اور ''اندھا دھند'' قابل ذکر ہیں۔ ''اندھا دھند'' کے نجیب کی پہلی شادی باپ کے جبری فیصلے کا نتیجہ تھا، جب کہ دوسری شادی وہ اپنی پسند سے کرتا ہے، اس بارے میں اپنے دوست سے کہتا ہے:

> میں اور میری دوسری بیوی تو اپنے خیالات اور احساسات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ہماری پسند کی شادی جو ہے۔ ہاں کبھی کبھار ایک دوسرے کی باتیں ضرور بری لگتی ہیں، مگر ہمارا اگنگ رشتہ نہیں ہے، جیسا میرا اور میری پہلی بیوی کا تھا[۵۷]۔

زبردستی کی شادی اگرچہ مرد اور عورت دونوں کی زندگی کو متاثر کرتی ہے، مگر عورت کی زندگی پہ اس کے اثرات گہرے ہوتے ہیں۔

یوں تو ایک بیوہ عورت کی دوبارہ شادی کے گرد بہت سے دقیانوسی تصوّرات جڑے ہیں، جو اتنی گہری جڑیں رکھتے ہیں کہ بیش تر اوقات اپنی بیوگی سے وابستہ تصوّرات کی پرداخت عورت خود ان تصوّرات کو اپنے ذہن کا حصہ بنا کر ان کی اوڑھنی تان کر زندگی بسر کرنے لگ جاتی ہے، تاہم بچوں کی کفالت اور نگہہ داشت کا مسئلہ سرِ فہرست ہوتا ہے[۵۸]۔ افسانہ "اجازت" میں ایک بیوہ عورت کی دوبارہ شادی کے معاملے سے وابستہ نفسیاتی و ممکنہ سماجی مسائل کی کیفیات کچھ یوں تھیں:

> ایک جوان عورت ہونے کے ناتے اس کے سر پر تن اور من کا بے انتہا بوجھ تھا۔ اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے ایک شریک حیات کی ضرورت تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بچوں والی عورت کو مرد تو مل سکتے ہیں مگر اس کے پہلے خاوند سے بچوں کو باپ نہیں مل سکتا! ہر مرد کی خواہش عورت ہوتی ہے، عورت کے بچوں کی نگہداشت نہیں![۵۹]۔

ازدواجی زندگی کا ایک اہم مسئلہ ساس کا منفی کردار ہے، افسانہ میں سایہ (shadow) کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے مصنف نے ساس کی شخصیت کے اس رخ کی نشان دہی کی ہے جس کی انتہائی صورت بے جا پابندیوں اور بیٹے پہ استحقاق کے نتیجے میں بسا اوقات بہوؤں پہ جذباتی، نفسیاتی، اور اپنی انتہائی صورت میں جسمانی تشدد کی صورت میں نکلتا ہے۔ مذہب، کلچر اور خاندان میں ماں کا مقام بعض اوقات نوجوان میاں بیوی کی زندگیوں پہ ایک مہیب سایہ بن کر چھا جاتا ہے۔

> بچوں کی خوشیاں 'بٹور' لگے آموں کے بور کی طرح چڑمڑ ہو کر بے جان سی رہ جاتی ہیں۔ پھلتی پھولتی نہیں ہیں[۶۰]۔

ممنوعہ اور غیر ازدواجی تعلقات کے حوالے سے افسانہ "الجھن" اور "بے بس" قابل ذکر ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد کے غیر ازدواجی تعلقات پہ خوب بات کی جاتی ہے، اور مرد بھی اس پہ بات کرنے کا عادی ہے، فرزانہ شیخ جب اپنے شوہر کی سرگرمیوں پہ اعتراض کرتی ہے، تو وہ کہتا ہے "آخر مرد ہوں، عورت کے پاس کیا عورت جائے گی؟[۶۱]" تاہم "الجھن" شادی شدہ عورت کے ممنوعہ ازدواجی تعلقات سے متعلق ہے جو عورت کی جنسیت کے حوالے سے مروجہ سماجی تصوّرات کی نفی کرتا ہے۔۔ شادی کے فوراً بعد روزینہ کا خاوند اس کو چھوڑ کر بیرون ملک چلا جاتا ہے اور اور وہ ایسی تنہائی کا شکار ہو جاتی ہیں جس کا مداوا کرنے کی کوشش میں وہ محرم رشتے کے ساتھ جنسی بے راہروی کا شکار ہو جاتی ہیں اور گھر کے مرد وزن جانتے بوجھتے ہوے ان پنپتے ہوئے ناجائز تعلقات سے اغماز برتتے ہیں[۶۲]۔ یہ ہمارے معاشرے میں چھپے ہوے وہ حساس معاملات ہیں جن پر بہت کم آواز اٹھائی گئی ہے۔

(ج) صنفی بنیاد پر تشدد اور جنسی استحصال

خواتین کی صنفی مساوات اور خود مختاری کی راہ میں یوں تو متعدد رکاوٹیں حائل ہیں، جن کا ہمارے کلچر، سماجی خود مختاری کے اداروں، اور سماجی اقدار سے بہت گہرا تعلق ہے۔ تعلیم اور معاشی خود مختاری کے ذریعے ان چیلنجز پہ قابو پانے کی سعی کی جا رہی

ہے۔ تاہم اعلیٰ تعلیم اور معاشی فکر سے آزادی کے باوجود خواتین کو گھریلو تشدد، ذاتی فیصلوں پہ جبر، جائے ملازمت پہ ہراسانی، اور منفی عوامی رویے کا سامنا ہے [۶۳]۔ خالد آفتاب نے اپنے افسانوں میں بچیوں کی آبروریزی، ازدواجی عصمت دری اور زبردستی کے جنسی تعلقات پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پہ حقوق نسواں کے علم بردار، اور صنفی علوم کے ماہرین دنیا بھر، بشمول پاکستان میں آواز بلند کر رہے ہیں۔

خالد آفتاب کے پہلے مجموعے جہاں اندر جہاں کا پہلا افسانہ "تماشا" ہے۔ بچپن میں جنسی ہوس و استحصال و تشدد کا شکار ہونے والی بچیاں اپنی آئندہ زندگی میں کن مسائل سے دوچار ہوتی ہیں، اس افسانے کا موضوع ہے۔ ایسے واقعات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تلخی، خوف، اور صدمے کی مثال مصنف نے ایک بھیانک اژدھے سے دی ہے جو نوخیز لڑکیوں کو ایسے دبوچ لیتا ہے کہ ان کی زبان شل ہو جاتی ہے اور وہ خوف، شرم، اور بے بسی کے باعث کچھ کہہ نہیں سکتیں، جب لالہ نے اپنی پانچ سالہ چچازاد نسیم کو رات کی تاریکی میں سوتے میں دبوچ لیا تو اس کی کیفیت کچھ یوں بیان کی گئی ہے:

> ایک کالا دبیز پردہ اس کے دماغ پر گرا اور اس کی سیاہی پھیلتی ہی چلی گئی، وہ لمحات اتنے طویل ہوئے کہ کم و بیش چالیس برس گزرنے کو آئے، نسیم کسی مرد کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات نہ کر پائی تھی۔ خوف کی وجہ سے ہم عمروں سے کھیلنا چھوڑا اور محض اپنی داخلی دنیا میں جینے لگی۔ [۶۴]

نسیم شادی سے متنفر تھی۔ اس کی شخصیت کے بجھے پن اور شادی کے بارے میں تصوّر کا احاطہ کچھ یوں کیا گیا ہے:

> کیا عجب تماشا ہے! شادی کرو تو بس کھٹا میٹھا مزا ملتا ہے۔ نہ کرو تو دوسروں کی گلی سڑی باتیں سن سن کر کان پکنے لگتے ہیں۔ نسیم کو تو سب مرد ایک دم برے لگتے تھے۔ ایک ایسی گھٹیا، خود غرض، اور درندہ صفت مخلوق جنھیں عورتوں کے نازک مزاج اور احساسات کا یک سر علم نہیں ہوتا۔ [۶۵]

تانیثی مفکرین بالخصوص بنیاد پرست تانیثیت پسند، شادی شدہ زندگی میں جبری جنسی تعلقات اور ازدواجی عصمت دری کو ایک اہم صنفی مسئلہ گردانتے ہیں۔ ازدواجی رشتے میں جنسی زیادتی کا تصوّر صدی کا ایک اہم موضوع ہے۔ ۱۹۷۰ء تک مغربی ممالک بشمول امریکہ اور برطانیہ ازدواجی عصمت دری کو ایک قابلِ تعزیر جرم نہ سمجھا جاتا تھا، بلکہ اس کا تصوّر بھی نہ تھا۔ ڈیانا رسل (Diana E. H. Russell۔۱۹۳۸ء-۲۰۲۰ء) نے شادی میں ریپ (*Rape in Marriage*-۱۹۸۲ء) لکھ کر اس حساس موضوع کی طرف دنیا کی توجہ مبذول کروائی [۶۶]۔ بیسویں صدی کے اواخر میں مختلف ملکوں میں ازدواجی عصمت دری کی اصطلاح کی وضاحت کی جانے لگی، اور قوانین وضع کیے جانے لگے، تاہم دنیا کے بیش تر ممالک میں آج بھی اس کو قابلِ اعتراض فعل نہیں گردانا جاتا۔ پاکستان جیسے پدرسری سماج میں اس کو قابل تعزیر نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اس عمل کو سماجی تائید حاصل ہے [۶۷]۔ اس کے بارے میں عورت کا بات کرنا ممنوع اور ناپسندیدہ ہے، بلکہ خواتین سماجی بدنامی، معاشرہ اور خاندان کی جانب سے موردالزام

ٹھہرائے جانے اور ممکنہ جارحانہ ردِعمل کے پیشِ نظر خاموشی اختیار کرتی ہیں اور ذہنی و جسمانی صحت کی بحالی کے لیے وسائل صرف کرنے سے گریز کرتی ہیں[۶۸]۔ فن کلاسیکی موسیقی سے آراستہ ''موناجی'' عرف معراج بیگم کو اس کا شوہر، قطع نظر اس کی حساسیت اور نازک خیالی کے، محض اپنی جسمانی ضروریات اور جنسی خواہشات پورا نہ کرنے کے سبب طلاق دے دیتا ہے۔ موناجی اپنے دل کی بات گلزار سے یوں بیان کرتی ہے:

> بیٹا، مرد تو صرف اپنی تشفی چاہتا ہے، جسمانی لذتوں کا دل دادہ ہوتا ہے۔ عورت اس کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کر جیتی ہے، چاہے وہ اس کھلونے سے کھیلے، چاہے اسے پھینک دے.... میرا خاوند تو جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا! اسے صرف اپنی جسمانی لذتوں کا خیال رہتا تھا، جو بھوت بن کر اس کے دماغ پر سوار رہتا تھا۔ کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، پہناوا، ہر چیز میں اسے جنس کا پرتو نظر آتا تھا۔[۶۹]

افسانہ ''تپش'' میں شادی کی رات کا احوال مصنف یوں بیان کرتا ہے:

> ملک جی نے اپنی دلھن کو یوں دبوچا جیسے شیر ہرن کے معصوم بچے کو پکڑتا ہے۔ (اور وہ سوچتی رہ جاتی ہے کہ).... "کیا شادی اسی کا نام ہے؟ کیا میاں بیوی کے رشتے کا یہی مطلب ہے؟ پیار کے بول، رومان، خوب صورت بات، انوکھا خیال، معصوم جذبات، کیا محض تخیل کی باتیں ہیں؟ وہ سب کچھ جو سنا تھا اور جس کے لیے اتنے برس انتظار کیا، اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔[۷۰]

ایسے جبری تعلقات کو برداشت کرنے اور ان پہ آواز نہ اٹھانے کا درس بالعموم لڑکیوں کی مائیں اور ساسیں دیتی ہیں، وہ لڑکیوں کی تربیت کے عمل میں ان کو مسلسل فرماں بردار بننے، مرد کا مطیع رہنے اور اپنی خانگی خوشیوں کی خاطر اپنی ذات کو قربان کر دینے کا درس دیتی ہیں اور ازدواجی عصمت دری کے بارے میں بات کرنے اور قانونی چارہ جوئی کرنے سے روکتی ہیں[۷۱]۔ شادی سے قبل روزی کی ساس کا کہنا تھا کہ اس کا بیٹا اتھرا ہے، لیکن دل کا اچھا ہے، اور روزی جیسی بیوی مل جائے گی تو اس کا اکھڑپن ختم ہو جائے گا۔ اور روزی سوچتی ہے:

> ...... کیا میری ساس مجھے باکسنگ بیگ تصوّر کرتی ہے؟ شاید بڑے بٹ صاحب نے اپنی بیوی کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہوگا! ہماری عورتوں کے کیسے فضول اور دقیانوسی خیالات ہیں۔[۷۲]

افسانہ ''چھوڑ دو'' میں خلاف مرضی، یک طرفہ اور زبردستی کے تعلقات کو اپنا حق سمجھ کر استوار کرنے کے نتیجے میں روزی اپنے خاوند گوگی بٹ کو غصے و نفرت سے جھٹک دیتی ہے اور گوگی بٹ سوچتا رہ جاتا ہے کہ آخر اس نے ایسا کون سا جرم کیا تھا، ''کیا وہ اس کا آدمی نہ تھا؟''[۷۳]۔ گوگی بٹ کا ذہنی تناؤ اس بات کا غماز ہے کہ سماجی صنفی کردار اور مردانگی کے تصوّرات ایک مرد کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں اور وہ انھیں باطنی طور پہ اپنا لیتا ہے اور فطری عمل جانتا ہے۔ ایما فلو اور اس کے ساتھیوں کی تحقیق کے

مطابق جنوبی ایشیا میں ۶۰ سے ۸۰ فیصد مردوں نے اس بیان سے اتفاق کیا کہ شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ جب چاہے جنسی تعلق قائم کرنے کا حق ہے[۷۴]۔ آخر ایسا کیوں ہے اور اس سوچ کے پسِ پشت کون سی ثقافتی اقدار، رسومات، تربیتی انداز اور صنفی کردار کارفرما ہیں۔ ماہرین کے نزدیک پدرسری نظام میں سکھلایا جاتا ہے کہ جنسی عمل آدمی کا حق اور عورت کی فرماں برداری کا نام ہے[۷۵]۔ سماجیات کے عمل میں ایک مرد کو سکھلایا جاتا ہے کہ مرد کی کیا خصوصیات ہونا چاہئیں، جن سے انحراف کی صورت میں معاشرہ اس کو طرح طرح کے القاب دیتا ہے۔ اس عمل میں تعلیمی ادارے، رفقا کا گروہ، مذہبی تعلیمات اور میڈیا اہم کردار ادا کرتا ہے[۷۶]۔ مردانگی کے اس تصوّر کی مکمل صورت ایک آدمی کا اپنی بیوی پہ مکمل اختیار رکھنا ہے، اس کو اپنی مرضی کے فیصلوں کا پابند بنانا اور ازدواجی معاملات میں اپنی اجارہ داری قائم کرنا سرِفہرست ہے۔ اسی طرح ایک عورت کو خاندان کی دوسری بزرگ عورت کے ذریعے مرد کا تابع فرمان بننے کی تربیت و تلقین کی جاتی ہے۔ مصنف نے اس حقیقت پہ روشنی ڈالی ہے کہ عورت کے ساتھ زبردستی کے تعلقات قائم کرنے کے عمل میں روایات، رسومات، اور سماجی طور طریقوں کی پاس داری کے نام پر خود عورتیں ہی سماجی ناانصافیوں کی ترویج کرتی ہیں۔

جائے ملازمت پہ ہراسانی درحقیقت خواتین اور کم زور افراد کے خلاف موجود طاقت کے درجات کو تقویت دینے کے مترادف ہے[۷۷]۔ افسانہ 'اے ٹی ایم' میں عصرِ حاضر میں سماجی و معاشی تبدیلیوں کے نتیجے میں ملازمت پیشہ خواتین کو درپیش مسائل کی حقیقی تصویر ہے۔ خواتین کی سماجی نقل و حرکت اور مخلوط ماحول میں کام کرنے کی وجہ سے ان کے انفرادی مسائل میں اضافہ ہو چکا ہے۔ دورانِ ملازمت مردوں کی غیر مطلوبہ رومانوی پیش قدمی ہراسانی کی ایک صورت ہے[۷۸]۔ وینیسا کے بوہنس (Vanessa K. Bohns) اور لارین اے ڈی ونسنٹ (Lauren A. DeVincent)، کے نزدیک ان "غیر مطلوبہ پیش قدمیوں" کو مسترد کرنا بہت دشوار اور پیچیدہ عمل ہے[۷۹]۔ ان رومانوی پیش قدمیوں کا تعلق، ثقافتی رسوم اور سماجی توقعات سے جڑا ہوتا ہے، جو کسی سماج میں عورت کی حیثیت اور مقام کا تعین بھی کرتا ہے۔ ایسے ماحول میں خواتین کو مساوی طور پر باصلاحیت ساتھی کارکن کی بجائے جنسی شے (sex object) سمجھ لیا جاتا ہے۔ افسانہ 'اے ٹی ایم' پڑھی لکھی ملازمت پیشہ خواتین کی ذہنی پختگی، خود اعتمادی اور استدلالی صلاحیتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ دفتری ماحول میں اپنے ادھیڑ عمر باس اور جوان ماتحت کی رومانوی پیش قدمیوں پر عذرا اپنی دوست رابعہ سے کہتی ہے:

> سنو رابعہ یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ کوئی بھی کسی کی جان نہیں ہوتا۔ سبھی ایک دوسرے سے کاروباری سی محبت کرتے ہیں۔ دورِ جدید میں انسانی رشتوں کا یہی المیہ ہے۔[۸۰]

دورانِ ملازمت مردوں کی عورتوں کی طرف رغبت کا اظہار افسانہ "وائرس" کی ماجدہ کچھ یوں کرتی ہے:

عورت کا وائرس بلا تخصیص ہر مرد کو لگتا ہے۔ اس کے سبب کچھ صرف زکام کا شکار ہو جاتے ہیں اور دوسرے فلو بمعہ بخار سے نڈھال۔[۸۱]

پاکستان میں خواتین کے خلاف جرائم کی ایک ابھرتی ہوئی واضح صورت معاشی استحصال ہے، جسے ماہرین جسمانی اور جذباتی تشدد کی طرح گھریلو تشدد کی ایک قسم گردانتے ہیں، جو جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوتی ہے، کیوں کہ معاشی انحصار خواتین کی خود مختاری کو مجروح کرتا ہے[۸۲]۔ افسانہ ''بڑی باجی'' اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد افسانہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسی بہت سی پڑھی لکھی اور ملازمت پیشہ غیر شادی شدہ خواتین ہیں جو بڑے کنبے کا فرد ہونے کی سبب اپنے والدین کے ساتھ مل کر اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا بوجھ اٹھا رہی ہیں۔ ان کی پرورش، تعلیم و تربیت، شادیوں اور دیگر امور میں اپنے ماں باپ کا ہاتھ بٹاتی ہیں، مگر اپنی تمام تر صلاحیتوں اور خوبیوں کے باوجود وہ اپنے لیے وقت کے ہاتھوں سے خوشیاں اور محفوظ مستقبل نہیں ڈھونڈ پاتیں۔ اس کہانی میں یہ پہلو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ ایسی بڑی باجیوں کے ماں باپ بھی ان کی ذاتی خوشیوں سے لا تعلقی اختیار کیے رکھتے ہیں اور اپنے باقی بچوں کا مستقبل محفوظ کرتے رہتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ افسانہ دور جدید کی ایسی لڑکیوں کی کتھا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے خاندان کی معاشی کفالت میں فعال کردار ادا کرتی ہیں، مگر اِن کے اپنے حقوق خود اِن کا خاندان سلب کر لیتا ہے۔ آج بھی بڑی باجی کا کردار نبھانے والی خواتین ہمیں ہر شعبۂ زندگی میں دکھائی دیتی ہیں جو اپنی خدمات سے اپنے کنبے کا سماجی و معاشی درجہ تو بڑھا دیتی ہیں مگر زندگی کی دوڑ میں خود کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہیں اور شادی جیسا بنیادی حق کھو دیتی ہیں[۸۳]۔

خالد آفتاب کے افسانے ''ٹیوننگ''، ''صادو''، اور ''نقصِ امن'' بین جنسیت کے مظہر کی عمدہ مثال ہیں۔ افسانہ 'ٹیوننگ' عورت کے معاشرے میں جنسی استحصال کے موضوع پہ ہے۔ جیسے گاڑیوں کو رواں دواں رکھنے کے لیے گاہے بہ گاہے ان کی ٹیوننگ کی جاتی ہے بعینہٖ ہمارے معاشرے میں مرد حضرات اپنی مردانگی کی ٹیوننگ کے لیے مجبور اور لاچار نوجوان لڑکیوں کو ان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے کے عوض ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں[۸۴]۔ دور حاضر میں ہر معاشرے، اور ہر شعبۂ زندگی میں معاشی ضرورتوں اور حصول ذریعہ معاش کے عوض سال ہا سال سے مردوں کے ہاتھوں عورتوں کی تذلیل کی داستان، زبانِ زد عام ہے۔ بین الاقوامی سطح پہ اٹھنے والی ''اجتماعی اعترافی تحریک'' (me too movement) درحقیقت وہ عالمی سماجی تحریک ہے جس میں خود عورتوں نے ان پر ہونے والے جنسی تشدد کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ یہ سماجی جنسی استحصال پاکستان جیسے مردانہ برتری پہ قائم معاشرے میں عام ہے۔ اس جبر اور ظلم و ستم کے خلاف 'نقص امن' کی چندی سب مردوں کو بے تکان گالیاں دیتی دکھائی دیتی ہے:

سب سور زادے ہیں.... لعنتی.... دس نمبری بد معاش.... ہر عورت کا تعاقب کرنے والے .... گوریلے .... بھیڑیے.... خون کے رسیا.... آؤ سب مل کر تعفن سے لبریز دماغوں والے مردوں کو خصی کر دیں۔[۸۵]

افسانہ ”صادو“، صنفی شناختوں کے باہمی ارتباط کا نظریہ (Intersectionality) اور اجارہ پسند مردانگی (Hegemonic masculinity) کی عمدہ مثال ہے۔ راعون کونیل اور جیمز ڈبلیو میسرشمٹ (James W. Messerschmidt۔ پ:۱۹۵۱ء) کا متفرق اور اجارہ پسند مردانگی کا نظریہ، درحقیقت مردانگی کی غالب اور سماجی طور پر قابل قدر شکل ہے جو مردانہ طاقت اور پدرسری نظام کو تقویت دیتی ہے۔ کونیل نے متفرق مردانگی (Multiple Masculinities) کے تصوّرات پیش کیے، جن میں شریک مردانگی، وہ مرد جو نظام کو فعال طور پر مضبوط کیے بغیر اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ماتحت مردانگی یعنی کم زور، جذباتی یا غیر جنس پرست اور پس ماندہ مردانگی پر اجارہ پسند مردانگی کی بالادستی تسلیم کی ہے[۸۶]۔ غریب اور ان پڑھ بوٹی کی بیوی کو وڈیرے کا اغوا کرنا، زبردستی کے جنسی مراسم استوار کرنا، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے کی پاداش میں اربابِ اختیار (زمین دار، مولوی صاحب اور اہل علاقہ) کی طرف سے گاؤں بدر ہو جانے کا حکم صنف سے منسلک، ان تصوّرات کی عکاسی کرتے ہیں اور ناانصافی اور جبر و ظلم کی مختلف مگر باہم متصل صورتوں کو عیاں کرتے ہیں[۸۷]۔

عورت جن ناروا رویّوں اور تکلیف دہ طرزِ عمل کی بھٹی سے گزرتی ہے، ان رویّوں کی آگے ترسیل پہ کیوں کر آمادہ ہوتی ہے؟ اس کا جواب ہمیں مشہور برازیلین معلم پاؤلو فریئر (Paulo Friere۔ ۱۹۲۱ء-۱۹۹۷ء) کی شہرہ آفاق کتاب، مظلوموں کی تدریسیات (*Pedagogy of the Oppressed*) میں ملتا ہے، جس کے مطابق ظلم سے نبرد آزما ہونے کے سلسلے کا پہلا مرحلہ ایک بار مظلوم کا خود پر ہونے والے ظلم کو سمجھنا اور اپنے ظالموں کا پتہ لگانا ہے، جب کہ اگلا اور اہم مرحلہ ہے: دوسروں کے ساتھ بات چیت۔ اس کی مدد سے انسان سازی کے ہدف کو حاصل کیا جاتا ہے[۸۸]۔ ہمارے ہاں عورت خود پر ہونے والے ظلم کا ادراک بھی رکھتی ہے اور ظلم کرنے والوں کو بھی جانتی ہے، مگر اس میں بات چیت کی جرأت مفقود ہوتی ہے، کیوں کہ ہمارا نام نہاد مشرقی معاشرہ عورت کے بات کرنے، بالخصوص دلیل سے بات کرنے کی تائید نہیں کرتا؛ اس لیے عورتوں کے ساتھ ہونے والے برے طرزِ عمل کی ترویج بالعموم عورتوں کے ذریعے ہی کی جاتی ہے۔ یہ عمل پدرسری نظام اور مرد کی بالادستی پہ مبنی معاشرے کی خاصیت ہے۔ جہاں مرد کے مردانگی، بالادستی، اور برتری کے تصوّرات کی ترویج و ترسیل عورت کو بذریعہ عورت قابو میں رکھنے کے ذریعے کی جاتی ہے۔ تاہم خالد آفتاب کے افسانوں کی عورت اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافی پہ نہ صرف بات کرتی دکھائی دیتی ہے بلکہ مردوں کی بالادستی، ان کے فرسودہ تصوّرات اور خیالات پہ تنقید بھی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا پاکستان میں بھی خواتین کی خود مختاری کو بڑھانے کا عمل ہمارے معاشرے میں مردانگی کی مختلف صورتوں کو سمجھے اور زیرِ بحث لائے بغیر ممکن نہیں۔

(د) تانیثی شعور، فیصلہ سازی اور خواتین کی استعدادِ اختیار

خالد آفتاب کے افسانے خواتین کی ذہنی بالیدگی، شعورِ ذات، اور سماجی بصیرت کی عکاسی کرتے ہیں۔ بدلتے ہوئے سماجی

رجحانات کا تعلق مصنف نے ایک طرف تو لڑکیوں کی تعلیم، اور معاشی خود مختاری اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی خود آگاہی، صنفی شعور، فیصلہ سازی کی صلاحیت اور خود مختاری سے جوڑا ہے، جس کی تائید سارہ لونگوے (Sarah Longwe) کے خواتین کو با اختیار بنانے کے فریم ورک (Women's Empowerment Framework-1995) اور ۱۹۹۹ء میں نائلہ کبیر کے صنفی مساوات اور بااختیار بنانے کے فریم ورک سے حاصل ہوتی ہے۔ سارہ لونگوے کے نزدیک خواتین کو بااختیار بنانے کا عمل پانچ بنیادی سطحوں پہ مشتمل ہے: فلاح و بہبود، رسائی، شعور، شرکت اور اختیار[۸۹]، جب کہ نائلہ کبیر نے خواتین کی خود مختاری کو وسائل کی دستیابی، فیصلہ سازی کی صلاحیت اور حاصل ہونے والی کامیابیوں کے ساتھ منسلک کیا ہے[۹۰]، تاہم اس کے نزدیک طاقت اور خود مختاری میں تفریق پائی جاتی ہے، طاقت متبادل مواقع میں انتخاب کرنے کی اہلیت کا نام ہے، جب کہ خود مختاری تبدیلی کے عمل کا نام ہے، جس میں فرد کے انتخاب میں مزاحم قوتیں کار فرما ہوتی ہیں جن پہ قابو پا کر ایک فرد اپنے حالات میں تبدیلی لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔

خالد آفتاب کی کہانیوں کی روشنی میں ہمیں پاکستانی خواتین، سارا لونگوے کے بیان کیے گئے تمام مدارج بشمول فلاح و بہبود، رسائی، یعنی وسائل کی سطح عبور کرتی اور شعور، شرکت اور سرگرمی کے مراحل میں سے گزرتی ہوئی، اختیار اور کامیابیوں کے پیچیدہ راستوں پہ گامزن دکھائی دیتی ہیں۔ اسی طرح نائلہ کبیر کے دیے گیے ماڈل کی روشنی میں پاکستانی خواتین وسائل، فیصلہ سازی اور کامیابیوں کے مختلف مدراج پہ جدوجہد کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ خواتین کی ترقی و تعمیر کا عمل صنفی تقسیم، جنسی رجحانات، طبقاتی تقسیم، رنگ، نسل، جغرافیائی رنگا رنگی اور مقامی کلچر سے متصل ہے، ان کی انفرادی و اجتماعی کاوشیں اکیسویں صدی کے پہلے ربع میں اپنی واضح اور ٹھوس صورتوں میں دکھائی دے رہی ہیں۔ تاہم ابھی انفرادی و سماجی سطح پہ پاکستانی عورتوں کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ ان کے فیصلہ سازی اور خود مختاری کی راہ میں حائل رکاوٹوں کی سب سے نمایاں صورت عورتوں پر ہونے والا جبر، ناانصافی اور جنسی استحصال ہے، جس کا اظہار ہمارے معاشرے میں صنف کی بنیاد پہ ہونے والے گھریلو تشدد، جنسی جرائم بالخصوص بچپن میں عصمت دری، زبردستی کے جنسی تعلقات، ازدواجی عصمت دری کے بڑھتے ہوئے واقعات کی صورت میں ہو رہا ہے۔ خواتین کے مقام میں بہتری کے لیے لڑکوں کی تربیت، بالخصوص جنس اور صنف کے حوالے سے مروجہ مذہبی و ثقافتی بیانیے پہ نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ ایسا اجارہ پسندانہ مردانگی کو صنفی شناخت کے ارتباطی تصوّر کے تناظر میں پرکھنے سے ہی ممکن ہے۔ بحیثیتِ مجموعی خالد آفتاب کے افسانے عصر حاضر میں خواتین کی خود آگاہی، خود مختاری اور صنف کی بنیاد پہ قائم کرداروں میں تعلیم، اور معاشی خود مختاری کے نتیجے میں ہونے والی تبدیلیوں اور سماج پہ اس کے اثرات کی عکاسی کرتے ہیں، جن کا ادراک سماجی علوم، بشمول صنفی علوم کے محققین کے لیے اہم ہے۔

حواشی و حوالہ جات

* (پ:۱۹۷۰ء)ڈائریکٹر، اکیڈیمک پلاننگ اینڈ ایکسٹرنل لنکس، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور۔ fouzia_shahin@hotmail.com

۱۔ خالد آفتاب (پ:۱۹۴۴ء) ملک کے نامور ماہر معاشیات، ماہر تعلیم اور منتظم ہیں۔ درس و تدریس اور تحقیق کے علاوہ انھوں نے پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور کے آخری پرنسپل اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے بانی وائس چانسلر کے طور پہ اٹھارہ سال کا طویل عرصہ اپنے فرائض سر انجام دیے۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے اپنے تجربات کو اپنی کتاب بعنوان تمام مشکلات کے خلاف: حقیقی دنیا میں ادارے کی تعمیر (*Against All Odds: Institution Building in the Real World*) (۲۰۱۷ء) میں پیش کیا۔ ان کی گراں قدر خدمات کے نتیجے میں حکومت پاکستان نے ان کو پرائیڈ آف پرفارمنس (۲۰۰۲ء)، اعزاز فضیلت (۱۹۹۴ء، ۲۰۰۴ء) اور سٹیزن ایوارڈ برائے ایکسیلینس ان پبلک سروس اینڈ انٹرپرائز (۲۰۰۲ء) کے اعلیٰ سول ایوارڈز سے نوازا ہے۔

۲۔ میری وولسٹون کرافٹ [Mary Wollstonecraft]، *A Vindication of the Rights of Woman: With Strictures on Political and, Moral Subject* (لندن: ٹی فشر، ۱۸۹۱ء)، ۱۲۔

اصل متن:

I do not wish them to have power over men but over themselves.

۳۔ سمون دی بووا [Simone de Beauvoir]، مترجم: ایچ ایم پارشلے [H.M. Parshley]، *The Second Sex-1949*، (لندن: جوناتھن کیپ، ۱۹۵۳ء)، ۱۸۔

اصل متن:

...they have always been subordinate to men.

۴۔ سمون دی بووا [Simone de Beauvoir]، مترجم: ایچ ایم پارشلے [H.M. Parshley]، *The Second Sex-1949*، ۱۶-۱۵۔

۵۔ سمون دی بووا [Simone de Beauvoir]، مترجم: ایچ ایم پارشلے [H.M. Parshley]، *The Second Sex-1949*، ۱۹۔

اصل متن:

...the two sexes have never shared the world in equality.

۶۔ بیٹی فریڈن [Betty Friedan]، *The Feminine Mystique* (نیویارک: نورٹن، ۱۹۶۳ء)، ۵۸، ۶۹، ۲۶۵۔

۷۔ ایضاً، ۴۴۔

...the problem that has no name.

۸۔ بیل ہکس [Bell Hooks]، *Feminism Is for Everybody: Passionate Politics* (لندن: پلوٹو پریس، ۲۰۰۰ء)، viii۔

۹۔ سمون دی بووا [Simone de Beauvoir]، مترجم: ایچ ایم پارشلے [H.M. Parshley]، *The Second Sex-1949*، ۶۸۱۔

اصل متن:

Woman is determined not by her hormones or by mysterious instincts, but by the manner in which her body and her relation to the world are modified through the action of others than herself.

۱۰۔ جوڈتھ بٹلر [Judith Butler]، *Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity* (نیویارک: روٹلیج، ۱۹۹۰ء)، ۴۳-۴۴۔

اصل متن:

Gender is the repeated stylization of the body, a set of repeated acts within a highly

rigid regulatory frame that congeal over time to produce the appearance of substance, of a natural sort of being.

۱۱۔ خالد آفتاب، جہاں اندر جہاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)

۱۲۔ خالد آفتاب، بھیدی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)

۱۳۔ خالد آفتاب، پوٹلی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۴ء)

۱۴۔ میشل فوکو [Michel Foucault]، *The History of Sexuality: An Introduction*، مترجم: رابرٹ ہرلی (Robert Hurley)، جلد ۱، (نیویارک: پینتھیون کتب، ۱۹۷۸ء)، ۱۱-۱۸۔

۱۵۔ رے وَن کونیل [Raewyn Connell]، اور جیمز ڈبلیو میسر شمٹ [James W. Messerschmidt]، "Hegemonic Masculinity: Rethinking the Concept"، مشمولہ *Gender & Society*، جلد ۱۹، شمارہ ۱۰، (۲۰۰۵ء)، ۸۲۹-۸۵۹۔
دیکھیے: https://psycnet.apa.org/doi/10.1037/0033-295X.88.4.354

۱۶۔ کمبرلی کرین شا [Kimberlé Crenshaw]، "Demarginalizing the Intersection of Race and Sex: A Black Feminist Critique of Antidiscrimination Doctrine, Feminist Theory and Antiracist Politics"، مشمولہ *Feminist Legal Theories*، مدیر: کیرن ماشکے [Karen Maschke]، (نیویارک: روٹلیج، ۲۰۱۳ء)، ۲۳-۵۱۔

۱۷۔ خالد آفتاب، "ڈرپوک"، مشمولہ بھیدی، ۷۷۔

۱۸۔ خالد آفتاب، "فرار"، مشمولہ بھیدی، ۹۷۔

۱۹۔ خالد آفتاب، "جینے کی آرزو"، مشمولہ بھیدی، ۲۷۔

۲۰۔ سینڈرا لپسٹز بیم [Sandra Lipsitz Bem]، "Gender Schema Theory: A Cognitive Account of Sex Typing"، مشمولہ *Psychological Review*، جلد ۸۸، شمارہ ۴ (۱۹۸۱ء)، ۳۵۴-۳۶۴۔
دیکھیے: https://psycnet.apa.org/doi/10.1037/0033-295X.88.4.354

۲۱۔ خالد آفتاب، "بھائی بند"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۹۸۔

۲۲۔ خالد آفتاب، "بائی بشیر"، مشمولہ بھیدی، ۴۱۔

۲۳۔ خالد آفتاب، "چھوڑدو"، مشمولہ بھیدی، ۱۲۵-۱۲۶۔

۲۴۔ خالد آفتاب، "بے بس"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۷۶۔

۲۵۔ خالد آفتاب، "اے ٹی ایم"، مشمولہ بھیدی، ۱۴۴۔

۲۶۔ خالد آفتاب، "میڈم"، مشمولہ بھیدی، ۱۱۶۔

۲۷۔ مائیکل ایس کیمل [Michael S. Kimmel]، *Misframing Men: The Politics of Contemporary Masculinities* (نیو جرسی: رٹجرز یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء)، ۳-۱۰۔

۲۸۔ ٹولمین، ڈیبورا ایل [Tolman Deborah L]، *Dilemmas of Desire: Teenage Girls Talk about Sexuality* (ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۵ء)، ۱۰۴-۱۰۵۔

۲۹۔ خالد آفتاب، "نقاب"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۹۸۔

۳۰۔ جوڈتھ بٹلر [Judith Butler]، *Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity* (نیویارک: روٹلیج، ۱۹۹۰ء)، ۱۴۶۔

۳۱۔ میشل فوکو[Paul-Michel Foucault]، مترجم: رابرٹ ہرلی[Robert Hurley]، *The History of Sexuality: An Introduction*، جلد ۱، (نیویارک پینتھیون کتب، ۱۹۷۸ء)۱۵۴-۱۵۹۔

۳۲۔ جوڈتھ بٹلر[Judith Butler]، *Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity*، ۴۹-۵۰۔

۳۳۔ رے وَن کونیل [Raewyn Connell]، اور جیمز ڈبلیو میسر شمٹ[James W. Messerschmidt]، "Hegemonic Masculinity: Rethinking the Concept"، مشمولہ *Gender & Society*، ۸۲۹-۸۵۹۔

۳۴۔ خالد آفتاب، "تپش"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۲۶۔

۳۵۔ خالد آفتاب، "ورولا" مشمولہ پوٹلی، ۸۶-۸۸۔

۳۶۔ خالد آفتاب، "لاک ڈاؤن"، مشمولہ پوٹلی، ۷۷۔

۳۷۔ پال آماتو[Paul R. Amato]، "Transformative Processes in Marriage: Some Thoughts from a Sociologist"، مشمولہ *Journal of Marriage and Family*، جلد ۶۹، شمارہ ۲، (۲۰۰۷ء)، ۳۰۵-۳۰۹۔
دیکھیے: https://www.jstor.org/stable/4622438

۳۸۔ ریچل جیوکس[Rachel Jewkes]، "Intimate Partner Violence: Causes and Prevention"، مشمولہ *The Lancet*، جلد ۳۵۹، (۲۰۰۲ء)، ۱۴۲۳-۱۴۲۹۔
دیکھیے: https://doi.org/10.1016/S0140-6736(02)08357-5

۳۹۔ خالد آفتاب، "پوٹلی"، مشمولہ پوٹلی، ۲۲۔

۴۰۔ خالد آفتاب، "کھوج"، مشمولہ پوٹلی، ۱۲۶۔

۴۱۔ بیل ہکس[Bell Hooks]، *Feminism Is for Everybody: Passionate Politics* (لندن: پلوٹو پریس، ۲۰۰۰ء)، ۷۰۔

۴۲۔ جیجی بھائے[Jejeebhoy]، شیریں جے[Shireen J.]، اور زیبا اے ستار[Zeba A. Sathar]، "Women's Autonomy in India and Pakistan: The Influence of Religion and Region "، مشمولہ *Population and Development Review*، جلد ۲۷، شمارہ ۴، (۲۰۰۱ء)، ۶۸۷-۷۱۲۔
دیکھیے: https://onlinelibrary.wiley.com/doi/pdf/10.1111/j.1728-4457.2001.00687.x

۴۳۔ مارسیا سی انہورن [Marcia C. Inhorn]، *Local Babies, Global Science: Gender, Religion and in Vitro Fertilization in Egypt* (نیویارک: روٹلیج، ۲۰۱۲ء)، ۲۲۵-۲۳۱۔

۴۴۔ خالد آفتاب، "پوٹلی"، مشمولہ پوٹلی، ۲۸۔

۴۵۔ شیریں جے۔ جیجی بھائے[Shireen J. Jejeebhoy]، اور زیبا اے ستار[Zeba A. Sathar]، "Women's Autonomy in India and Pakistan: The Influence of Religion and Region "، مشمولہ *Population and Development Review*، جلد ۲۷، شمارہ ۴، ۶۸۷-۷۱۲۔

۴۶۔ خالد آفتاب، "اندیشہ"، مشمولہ بھیدی، ۱۰۷۔

۴۷۔ خالد آفتاب، "بھیدی"، مشمولہ بھیدی، ۴۷۔

۴۸۔ خالد آفتاب، "اے ٹی ایم"، مشمولہ بھیدی، ۱۴۷۔

۴۹۔ خالد آفتاب، "میڈم"، مشمولہ بھیدی، ۱۱۲۔

۵۰۔ خالد آفتاب، "بے بس"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۷۴۔

۵۱۔ مارسیا سی انہورن [Marcia C. Inhorn]، *Local Babies, Global Science: Gender, Religion and in Vitro Fertilization in Egypt*، ۱۰-۱۱۔

۵۲۔ معظم نصراللہ، روبینہ ذاکر اور الیگزینڈر کرامر [Alexander Krämer]، "Effect of child marriage on use of maternal health care services in Pakistan"، مشمولہ *Obstetrics & Gynecology*، جلد ۱۲۳، شمارہ ۳، (۲۰۰۱ء)، ۵۰۷-۵۱۴۔
دیکھیے: https://onlinelibrary.wiley.com/doi/pdf/10.1111/j.1728-4457.2001.00687.x

۵۳۔ خالد آفتاب، "بے بس"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۷۶۔

۵۴۔ خالد آفتاب، "تپش"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۶۴۔

۵۵۔ صوفیہ نوید اور خالد منظور بٹ، "Causes and Consequences of Child Marriages in South Asia: Pakistan's Perspective"، مشمولہ *South Asian Studies*، جلد ۳۰، شمارہ ۲ (۲۰۲۰ء)، ۱۶۱-۱۷۵۔
دیکھیے: https://sasj.pu.edu.pk/9/article/view/922/921

۵۶۔ ماریہ مظفر جنجوعہ، انیلہ کمال، "Understanding the Role of Patriarchy in Perpetuating Child Marriages in Pakistan: A Qualitative Exploration"، مشمولہ *Psychological Review*، جلد ۵، شمارہ ۴، (۲۰۲۴ء)، ۱۱۷-۱۳۱۔
دیکھیے: https://doi.org/10.47205/jdss.2024(5-IV)11

۵۷۔ خالد آفتاب، "اندھا دھند"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۱۵۸۔

۵۸۔ مریم ظفر، ہمیرا یاسین، عظمیٰ عاشق خان اور نازیہ صلاح الدین، "Psycho-social Challenges Faced by Working Widows in Pakistan"، مشمولہ *Journal of Arts & Social Sciences*، جلد ۱۰، شمارہ ۱، (۲۰۲۳ء)، ۲۰۸-۲۱۸۔
دیکھیے: https://doi.org/10.46662/jass.v10i1.403

۵۹۔ خالد آفتاب، "اجازت"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۱۹۴۔

۶۰۔ خالد آفتاب، "سایہ"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۱۵۲۔

۶۱۔ خالد آفتاب، "بے بس"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۷۶-

۶۲۔ خالد آفتاب، "الجھن"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۴۳۔

۶۳۔ فوزیہ شاہین اور رعنا ملک، "Socio cultural Barriers to Empowerment of Female University Teachers: An Exploratory Factor Analysis"، مشمولہ *Pakistan Journal of Education*، جلد ۳۹، شمارہ ۲ (۲۰۲۲ء)، ۷۳-۹۴۔
دیکھیے: https://ojs.aiou.edu.pk/index.php/pje/article/view/881

۶۴۔ خالد آفتاب، "تماشا"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۱۱۔

۶۵۔ خالد آفتاب، "تماشا"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۹۔

۶۶۔ ڈیانا۔ای۔ایچ رسل [Diana E.H. Russell]، *Rape in Marriage* (بلومنگٹن: انڈیانا یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۰ء)۔

۶۷۔ اقرا سلیم خان، "Consent in Marriage: A Radical Feminist, Analysis of Pakistani Law"، مشمولہ *Race Gender*

& Society، جلد ۲۶، (۲۰۱۹ء)، ۶۷۱–۶۸۷۔
دیکھیے: https://scholarship.law.wm.edu/wmjowl/vol26/iss3/6

۶۸۔ عنیزہ نیاز، "Violence against Women in South Asian countries"، مشمولہ *Pakistan Journal of Education*، جلد ۶ (۲۰۰۳ء)، ۱۷۳–۱۸۴۔
دیکھیے: https://link.springer.com/article/10.1007/s00737-003-0171-9

۶۹۔ خالد آفتاب، "موناجی"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۳۰۔

۷۰۔ خالد آفتاب، "تپش"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۲۶۔

۷۱۔ روبینہ ذاکر، محمد زکریا ذاکر، اور صفدر عباس، "Domestic Violence Against Rural Women in Pakistan: An Issue of Health and Human Rights"، مشمولہ *Journal of Family Violence*، جلد ۳۱ (۲۰۱۶ء)، ۱۵–۲۵۔

۷۲۔ خالد آفتاب، "چھوڑدو"، مشمولہ بھیدی، ۱۲۷۔

۷۳۔ خالد آفتاب، "چھوڑدو"، مشمولہ بھیدی، ۱۲۸۔

۷۴۔ ایما فولو [Emma Fulu]، ریچل جیوکس [Rachel Jewkes]، ٹم روزلی [Tim Roselli]، اور کلاڈیا گارسیا [Claudia Garcia-Moreno]، "Prevalence of and Factors Associated with Male Perpetration of Intimate Partner Violence: Findings from the UN Multi-Country Cross-Sectional Study on Men and Violence in Asia and the Pacific"، مشمولہ *The Lancet Global Health*، جلد ۱، شمارہ ۴ (۲۰۱۳ء)، ای ۱۸۷–ای ۲۰۷۔

۷۵۔ شیریں جے۔ جیجی بھائے [Shireen J. Jejeebhoy]، اور سارہ باٹ [Sarah Bott]، *Non-consensual Sexual Experiences of Young People: A Review of the Evidence from Developing Countries* (دہلی: پاپولیشن کونسل، ۲۰۰۳ء)، ۱۶۔

۷۶۔ مائیکل فلڈ [Michael Flood]، "The Harms of Pornography Exposure Among Children and Young People"، مشمولہ *Child Abuse Review*، جلد ۱۸، شمارہ ۶ (۲۰۰۹ء)، ۳۸۴–۴۰۰۔

۷۷۔ کیتھرین اے میک کینن [Catharine A. MacKinnon]، *Sexual Harassment of Working Women: A Case of Sex Discrimination* (نیویارک: ییل یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۹ء)، ۱–۴۔

۷۸۔ چارلس اے پیئرس [Charles A. Pierce]، اور ہرمن اگونیس [Herman Aguinis]، "Bridging the Gap between Romantic Relationships and Sexual Harassment in Organizations"، مشمولہ *Journal of Organizational Behavior: The International Journal of Industrial, Occupational and Organizational Psychology and Behavior* جلد ۱۸، شمارہ ۳، (۱۹۹۷ء)، ۱۹۷–۲۰۰۔

۷۹۔ وینیسا کے بوہنس [Vanessa K. Bohns]، اور لارین اے ڈی ونسنٹ [Lauren A. DeVincent]، "Rejecting Unwanted Romantic Advances is More Difficult than Suitors Realize"، مشمولہ *Social Psychological and Personality Science* جلد ۸، شمارہ ۱۰، (۲۰۱۹ء)، ۱۱۰۲–۱۱۱۰۔

۸۰۔ خالد آفتاب، "اے ٹی ایم"، مشمولہ بھیدی، ۱۴۳–۱۴۴۔

۸۱۔ خالد آفتاب، "وائرس"، مشمولہ بھیدی، ۱۸۲۔

۸۲۔ ایلیف سارک[Elif Sarac]، ڈینیز اوڈاباس[Deniz Odabas]، "Gender-based Economic Violence and the Exploitation of Women: A Deep Dive"، مشمولہ *World Journal of Psychiatry*، جلد ۱۵، شمارہ ۳ (۲۰۲۵ء)، ۴۔

۸۳۔ خالد آفتاب، "بڑی باجی"، مشمولہ بھیدی، ۷۹-۸۷۔

۸۴۔ خالد آفتاب، "ٹیونگ"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۱۹۹-۲۰۶۔

۸۵۔ خالد آفتاب، "نقص امن"، مشمولہ جہاں اندر جہاں، ۱۰۶۔

۸۶۔ رے وَن کونیل [Raewyn Connell]، اور جیمز ڈبلیو میسر شمٹ[James W. Messerschmidt]، "Hegemonic Masculinity: Rethinking the Concept"، مشمولہ *Gender & Society*، جلد ۱۹، شمارہ ۱۰، (۲۰۰۵ء)، ۸۲۹-۸۵۹۔

۸۷۔ خالد آفتاب، "صادو"، مشمولہ پوٹلی، ۲۸۔

۸۸۔ پاؤلو فریئر[Paulo Freire]، مترجم: مائرا برگ مین راموس[Myra Bergman Ramos]، *Pedagogy of the Oppressed (1963)*، (نیویارک: سیبری پریس، ۱۹۷۰ء)، ۴۳-۱۳۰۔

۸۹۔ سارہ ہلوپکل لونگوے[Sara Hlupekile Longwe]، "Education for Women's Empowerment or Schooling for Women's Subordination?"، مشمولہ *Gender & Development*، جلد ۶، شمارہ ۲، (۱۹۹۸ء)، ۱۹-۲۶۔

۹۰۔ نائلہ کبیر، "Resources, Agency, Achievements: Reflections on the Measurement of Women's Empowerment"، مشمولہ *Development and Change*، جلد ۳۰، شمارہ ۳، (۱۹۹۹ء)، ۴۳۵-۴۶۴۔

Bibliography

Betty Friedan, *The Feminine Mystique*. W. W. Norton & Company, 1963.

Bohns, Vanessa K., and Lauren A. DeVincent. "Rejecting Unwanted Romantic Advances is More Difficult than Suitors Realize."in *Social Psychological and Personality Science*, 10 (8), 1102-1110, 2019.

Butler, J. *Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity*. Routledge, 1990.

Connell, Raewyn., and James W. Messerschmidt. “Hegemonic Masculinity: Rethinking the Concept.” *Gender & Society*. 19(6), 829-859, 2005.

Crenshaw, Kimberlé. "Demarginalizing the Intersection of Race and Sex: A Black Feminist Critique of Antidiscrimination Doctrine, Feminist Theory and Antiracist Politics." *Feminist Legal Theories*. Routledge. 23-51, 2013.

Foucault, M. *The History of Sexuality*. New York: Pantheon Books, 1978.

Freire, P. *Pedagogy of the Oppressed*. New York: Seabury Press, 1970.

Judith Butler, *Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity*. New York: Rutledge, 1990.

Kabeer, N. “Resources, Agency, Achievements: Reflections on the Measurement of Women's Empowerment”. *Development and Change*, 30(3), 435-464, 1999.

Khalid Aftab, *Bhedī*. Sang e Meel Publications, 2018.

_____, *Jehān Ander Jehān*. Sang e Meel Publications, 2014

_____, *Potlī*. Sang e Meel Publications, 2024.

Kimmel, Michael S. *Misframing Men*: *The Politics of Contemporary Masculinities*. Rutgers University Press, 2010.

Longwe, S. H. Education for Women's Empowerment or Schooling for Women's Subordination? *Gender & Development*, 6(2), 1998, 19-26.

Mary Wollstonecraft, *A Vindication of the Rights of Woman, with Strictures on Political and Moral Subjects*. T. Fisher, 1891.

Paul Michel Foucault, *The History of Sexuality: An Introduction*, volume I. Trans. Robert Hurley. New York: Pantheon Books, 1978.

Simone de Beauvoir, *The Second Sex* (1949). Translated by H.M. Parshley.London: Jonathan Cape,1953.

Tolman, Deborah L. *Dilemmas of Desire: Teenage Girls Talk about Sexuality*. Harvard University Press, 2005.